عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ

طلوعِ اسلام

FEBRUARY 1940

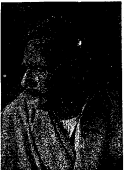

یادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہی جوانوں میں
نظر آتی ہی اسکو اپنی منزل آسمانوں میں

(۱) بانی تحریک پاکستان جناب چودھری رحمت علی صاحب

(۲) جناب میاں عبدالحق صاحب: سابق صدر پاکستان نیشنل کانگرس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

(دور جدید)

مرتب

محمد ظہیر الدین صدیقی۔ بی ایس سی

بدل اشتراک

پانچ روپیہ سالانہ فی پرچہ ۸/

ششماھی تین روپے

جلد ۳ شمارہ ۲ ذوالحجہ ۱۳۵۸ھ مطابق فروری ۱۹۴۰ء

فہرست مضامین

۱	سپاس نامہ	(بخدمت بانی تحریک پاکستان)......	۱-۲
۲	پاکستان	(ایک پاکستانی کی نگاہ میں).........	۳
۳	لمعات	ادارہ	۴-
۴	باب المراسلات		۱۲-۱۶
۵	کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی	للشیخ الفاضل	۱۷-۳۹
۶	عقل وعشق	حضرت وسیلا ملتانی	۴۰
۷	نیشنلسٹ علماء (۲)	ایک مسلمان	۴۱-۷۵
۸	نقد ونظر	ادارہ	۷۶-۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بہ شرف نظر۔

پروانۂ شمع اقبالؒ ۔ علمبردار پیغام حضرت حکیم الامتؒ بانیٔ تحریک پاکستان ۔

جناب چودھری رحمت علی صاحب ایدہ اللہ بنصرہ ۔

برادر عزیز!

انسانی زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب قلبی کیفیات کی بے پناہ وسعتیں ذرائع اظہار کی تنگیٔ داماں کی شکوہ سنج ہو جاتی ہیں ۔ ارض پاکستان میں آپ کی مراجعت سے ہمارا قلب، مسرت و شادمانی کے جن حدود فراموش جذبات سے کوثر بجام ہے ۔ وہ ہماری ہزار کوششوں کے باوجود الفاظ کے پیکرِ محسوس میں مقید نہیں ہو سکتے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپ نے پاکستان سے دور ۔ انگلستان میں بیٹھ کر بھی حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے پیغام حیات آفریں کی نشر و اشاعت اور حکومت الٰہیہ کے قیام سے متعلق ان کے تصورات عالیہ کی عملی تشکیل کے لیے اپنی زندگی کے عزیز ترین لمحات کو جس سعیٔ پیہم اور تگ و دوِ مسلسل میں صرف کیا ہے وہ اس امر کے آئینہ دار ہیں کہ ایک مردِ مومن پر زمان و مکان کی پابندیاں اثر انداز نہیں ہو سکتیں ۔ اور وہ جہاں بھی ہو اپنے سوزِ عشق اور حرارت ایمانی سے باعث گرمیٔ محفل بنا رہتا ہے ۔ لیکن ایسے وقت میں جبکہ خاکِ پاکستان کا ایک ایک ذرہ بگولوں کی طرح اُٹھ اُٹھ کر آپ کی راہ تکتا تھا ۔ زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ایک دنیا اپنے جلو میں لیکر آپ کا مراجعت فرمائے پاکستان ہونا گلکدۂ ملت کے لیے بہار تازہ کی نوید اور بزم ارادت کیشانِ حضرت علامہؒ میں حیات نو کی دلیل ہے ۔ آپ یقیناً ایسے وقت میں تشریف لائے ہیں جبکہ رہروانِ منزلِ شوق کو قدم قدم پر آپکی کمی محسوس ہو رہی تھی ۔ اس سفر میں

آپ کی معیت دلوں میں تازہ ولولے۔ نگاہوں میں تیزی۔ رگوں میں خون گرم۔ پاؤں میں استقامت ہمتوں میں بلندی اور ارادوں میں استقلال پیدا کر دے گی۔ اور اجتماعیت۔ مرکزیت۔ اور طاعت امیر کا وہ فراموش کردہ پیام قرآنی۔ جو خدا خدا کر کے ملّتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی نگاہوں کے سامنے آیا ہے۔ آپ کے نغمۂ آتشیں سے واضح تر ہو جائیگا۔ آپ کی نگاہوں سے یقیناً یہ حقیقت مستور نہ ہوگی کہ آج وہی آواز حق کی آواز ہو سکتی ہے جو ہیئتِ اجتماعیہ کی طرف ملّت کے موجودہ رجحان میں تقویت کا باعث ہو۔ نہ وہ جو اپنی قیادت کے شوق میں جدید مرکزیت کی دعوت دے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کے "ناصحان ملّت" نے کشتیٔ ملّت میں کس قدر سوراخ کر رکھے ہیں جو ناخدائے کشتیٔ ملّت کے لئے جگر کے ناسور بن رہے ہیں۔ ایسے وقت میں آپکی تشریف آوری یقیناً قائدِ ملّت کے لئے بڑی تقویت کا باعث ہوگی۔

اخیٔ محترم!

ہم، ارادتمندانِ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی طرف سے بالعموم۔ اور حلقۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے بالخصوص آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہوئے دیدہ و دل فرشِ راہ کرتے ہیں۔ اور بصمیم قلب بحضور ایزدِ متعال دست بدعا ہیں کہ اس کی رحمتیں اور نصرتیں قدم قدم پر آپ کا ساتھ دیں۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

نیازمندان

کارکنانِ ادارۂ طلوعِ اسلام۔ دہلی

پاکستان

(ایک پاکستانی کے قلم سے)

وقت آپہنچا کہ ہو جائے یہاں ختم جھگڑا کفر اور ایمان کا
زندگی ہندو گذارے چین سے بے مسلماں سانس اطمینان کا
ہو نہ کچھ تہذیب کا خطرہ اسے اور نہ اسکو خوف مال اور جان کا
شیخ ہو یا برہمن، مالک بنے اپنے اپنے نفع اور نقصان کا
دونو اپنے اپنے حلقے بانٹ کر رشتہ گانٹھیں صلح کے پیمان کا
جوڑ ہو پھر سرحد و کشمیر سے سندھ و پنجاب و بلوچستان کا
ایسی اسلامی حکومت چاہیے ہو جہاں قانون بھی قرآن کا
آرہے ہیں چوہدری رحمت علی لیکے مقصد انقلابی شان کا
ہندِ مصنوعی! اُٹھ استقبال کر
بانیٔ تحریکِ پاکستان کا

لمعات

جس قدر کسی قوم پر انحطاط ہو گا اُسی قدر اس کی قوتِ عمل مفقود ہو جائیگی۔ اور جوں جوں قوتِ عمل کم ہوتی جائیگی بیجا تنقید۔ بے معنی نکتہ چینی اور نظری اعتراضات کا مادّہ بڑھتا جائے گا۔ زندہ قوموں کی حالت اس سے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ وہ کامل غور و تدبر کے بعد اپنے نصب العین کو متعین کر کے راہِ عمل تجویز کر لیتی ہیں اور اس کے بعد جوشِ کردار میں مست۔ این و آں سے بے خبر۔ والہانہ منزلِ مقصود کی طرف بڑھے جاتی ہیں۔ کام کرنے والوں کو باتیں کرنے کی فرصت کہاں؟

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں ۔۔۔ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ہندوستان کے مسلمان کے بانند چونکہ عام طور پر قوتِ عمل سے محروم ہو چکے ہیں اس لئے اس کے دماغ میں بے معنی نکتہ چینی کی عادت اسی اعتبار سے بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ ہمیں آئے دن اس قسم کے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں کہ تم لیگ جیسی جماعت کی حمایت کس طرح کرتے ہو جبکہ یہ عام طور پر ایسے افراد پر مشتمل ہے جن کی سیرت (بلکہ صورت بھی) مسلمانوں کے معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ ان کے دل جوشِ عمل سے عاری۔ ان کی نگاہیں بصیرتِ قرآنی سے محروم اور ان کے دماغ علومِ دین سے ناآشنا ہیں۔ ہم ان اعتراضات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے کیونکہ ہم اس سے پیشتر کئی مرتبہ واضح کر چکے ہیں کہ اسوقت ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہ کیوں ضروری ہے کہ وہ لیگ کی حمایت کریں۔ لیکن ان معترضین کی صف میں ہمیں بعض ایسے حضرات بھی ملتے ہیں جن کے خلوصِ نیت کے متعلق شبہ کی بہت کم گنجائش ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسموم فضا سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں جس میں اس قسم کے خیالات کو عام طور پر پھیلایا جاتا ہے۔ اس لئے ان کے اعتراضات بحث و جدل کی خاطر نہیں بلکہ طمانیتِ قلب کیلئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان حضرات کی تسکینِ خاطر کے پیشِ نظر ہم اس حقیقت کو آج پھر دُہراتے ہیں جس کا اعلان اس سے پیشتر کئی بار کیا جا چکا ہے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک عظیم الشان قافلہ تھا۔ جو اپنی منزل متعین کرکے "حجاز" کی طرف چلا۔ راستہ میں اس نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ تھکے ماندے راہرو ستانے کے لئے لیٹ گئے۔ اُٹھے تو اِدھر اُدھر نکل گئے کہ کچھ کھانے پینے کا سامان کریں۔ یوں ہی پھر رہے تھے کہ ایک طرف کُنبھ کا میلہ دکھائی دیا۔ شوقِ تماشا میں اُدھر لپک گئے۔ میلے کا ہجوم۔ تاشے گاجے کا شور۔ تفریح کے سامان۔ عیش و نشاط کی محفلیں۔ کچھ ایسے جذب ہوئے کہ یہ بھول ہی گئے کہ ہم کہاں سے آئے تھے اور کدھر جا رہا تھا۔ ایک سے ایک جدا ہو گیا۔ کوئی اس ٹولی میں جا ملا۔ کوئی اس گروہ میں۔ اور یوں میلے کے ریلے میں ایسے بہ گئے جیسے سیلاب میں ایک پرِ کاہ۔ میلہ تھا یاتریوں کا۔ ان کا رُخ تھا گنگا کی طرف۔ یہ بھی اُن کے ساتھ اُسی طرف بہنے لگے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انہی میں کے ایک راہرو کو خیال پیدا ہوا کہ ارے یہ کیا ہو گیا! پورے کا پورا قافلہ اپنی ہیئتِ قافلیہ کو کھو کر میلے کی لہروں میں ریت کے ذرّوں کی طرح بہ گیا۔ وہ میلے سے ہٹ کر ایک ٹیلے پر کھڑا ہو گیا اور لگا زور زور سے چلّانے کہ "او بھائی قافلہ والو! سُنو تو سہی۔ تم کہاں کھو گئے۔ ادھر ادھر آؤ! ایک ایک کرکے اس میلے سے باہر آ جاؤ اور یہاں جمع ہو جاؤ۔" قافلہ والوں میں سے اکثر نے کان کھڑے کئے۔ مُڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس آواز نے انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ واقعی قافلہ والوں کو یوں بکھر کر تو نہیں رہنا چاہئے۔ روحیں سعید تھیں۔ فطرت کی آواز نے دل کو اپیل کیا۔ میلے کی جاذبیتوں میں اُلجھا ہوا دامن جھٹک کر باہر آ گئے اور اس بُلانے والے کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے سفر کی صعوبات کے مقابلہ میں میلہ کی طرب انگیز۔ تن آسانی کی زندگی کو ترجیح دی۔ اُدھر یاتری بھی یہی چاہتے تھے کہ اہلِ قافلہ انہی میں گھُل مِل جائیں۔ انھوں نے بھی ان سے یہی کہا کہ دیکھو اس قدر جمِ غفیر کا ساتھ چھوڑ کر۔ ایسی پُر لطف محفلوں کو خیر باد کہکر۔ جس میں تمھیں نہ کمانے کی فکر نہ پکانے کی۔ پھر وہی صحرا نوردی اور دشت پیمائی۔ وہی غربت و افلاس کی زندگی اختیار کر لینا کہاں کی دانش اطواری ہے۔ مقصد تو محض "اشنان" ہے۔ زمزم میں نہ کیا گنگا میں کر لیا۔ جس خدا کا وہاں پانی ہے اُسی کا

یہاں بھی ہے۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ یہ میلے والوں کے ساتھ ہی بڑھتے گئے۔ انھوں نے کہا کہ دیکھو! تمھارے ساتھی کدھر جا رہے ہیں۔ انھیں بھی سمجھاؤ کہ تمھارے ساتھ ہی رہیں۔ چنانچہ انھوں نے اِدھر چلانا شروع کر دیا کہ ارے! اُدھر نہ جانا۔ کیا پہلی مصیبتیں بھول گئے!

بدبختی یہ کہ ہیئتِ قافلیہ کی طرف بلانے والے کے نہ ڈاڑھی تھی نہ جبّہ اور عمامہ۔ اور دوسری طرف آواز دینے والوں کی شکل و صورت تھی خیر سے متشرع اور کمر پہ کتابوں کا بوجھ۔ اب کہئے کہ بکھرے ہوئے قافلہ کے افراد محض اس لئے یا تو والوں کے طرفداروں کی جانب چلے جائیں کہ دوسری طرف کا آواز دینے والا "مولوی صاحب" نہیں ہے۔ یا اتفاق سے جو لوگ پہلے اس کے گرد جمع ہو چکے ہیں وہ قافلہ کے کمزور افراد میں سے ہیں! ہمارا مسلک یہ ہے کہ اس وقت ان دونوں آوازوں میں حق کی آواز اُس طرف سے آ رہی ہے جو اس منتشر قافلہ کے کھوئے ہوئے افراد کو پھر سے ہیئتِ قافلیہ کی تشکیل کی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے ہر وہ شخص جو اِس وقت اُس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اس کی آواز کو بلند کرے گا وہ قافلہ والوں کا حقیقی بہی خواہ ہے۔ ہم اس آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہیں تاکہ یہ آواز اِس قدر بلند ہو جائے کہ قافلہ کے ایک ایک راہرو کے کان تک پہنچ جائے۔ اس افراتفری کے عالم میں۔ اس تشتت و انتشار کی حالت میں جس میں یہ بکھرا ہوا کارواں مبتلا ہے قطعاً اس کی فرصت نہیں اور نہ ہی ضرورت کہ ہم اس کا موازنہ کریں کہ دونوں اطراف کے داعیوں میں سے کس کی شکل و صورت مسلمانوں کے آئینہ میں صحیح اُترتی ہے۔ قافلہ کے تمام افراد کو یکجا جمع ہونے دیجئے۔ ان کی گم گشتہ ہیئتِ قافلیہ کی پھر سے ترتیب ہو جانے اس کے بعد اس امر کا بھی فیصلہ کر لیا جائے گا۔

پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو میلے سے تو باہر ہیں لیکن ایک طرف الگ کھڑے ہر اِدھر آنے والے کے کان میں کہہ دیتے ہیں کہ دیکھنا! اس کی طرف نہ جانا۔ وہ تمھیں "حجاز" کے بجائے "ترکستان" کی طرف لے جائیگا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اس چیز کے فیصلہ کا وقت بھی ابھی نہیں آیا کہ یہ راہی

اِس قافلہ کو کدھر لے جائیگا۔ یہاں تو ابھی قافلہ کا وجود ہی غائب ہے۔ راستے کے تعین کا سوال تو بعد کی چیز ہے۔ فرض کر لیجیے کہ آپ کے شکوک بجا ہیں لیکن قافلہ جمع ہو جانے میں کیا حرج ہے۔ جب قافلہ کے تمام افراد یکجا ہو جائینگے اُس وقت یہ بھی فیصلہ کر لیجیئیگا کہ اب اس کا رُخ کدھر کو ہونا چاہیے۔

یہ بھی تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجیے کہ یہ صاحب اس قافلہ کو "ترکستان" کی طرف لے جائینگے۔ لیکن اس صورت میں بھی صحیح راہِ صواب یہی ہوگی کہ آپ اس قافلہ کے ساتھ رہئے۔ قافلہ کو چلتا جانے دیجئے اور آپ راہروؤں کو بتاتے جائیے کہ "دیکھو بھائی! یہ راستہ حجاز کی طرف نہیں جا رہا۔ دیکھتے نہیں ہو حجاز کے راستہ میں اس قسم کے کھنڈرات کہاں آتے تھے! وہاں اس قسم کی جھاڑیاں کہاں تھیں! یہ آموں کے باغ عرب کی زمین میں نہیں ہو سکتے!" یقین مانئے کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان قافلہ والوں کو خود بخود معلوم ہو جائیگا کہ واقعی یہ میرِ کارواں اُنھیں سیدھے راستہ پر نہیں لے جا رہا۔ اس لئے کہ

کم کوشش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی:

اُس وقت اگر میرِ کارواں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو یا تو وہ خود سیدھے راستہ پر آ جائیگا۔ یا قافلہ کی قیادت راہ شناس لوگوں کے سپرد کر دیگا۔ اور اگر وہ خود ایسا نہ کریگا تو قافلہ والے اُسے مجبور کر دینگے کہ وہ ایسا کرے۔ اُس وقت آپ شوق سے زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیجیئیگا۔

لہٰذا سب سے پہلی چیز تو ہیئتِ قافلہ کی ازسرِ نو ترتیب و تشکیل ہے۔ باقی باتیں بعد کی ہیں۔ ہمارا منتہائے نگاہ بھی حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ اِس نظامِ حکومت کے پُرزے وہی لوگ ہو سکینگے جن کی سیرت و کردار قرآنی معیار پر پورے اُتریںگے۔ لیکن اس وقت تو صرف ایک مقصد پیشِ نظر ہے اور وہ یہ کہ قافلہ کے کھوئے ہوئے افراد کو کسی نہ کسی طرح پھر سے قافلہ کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس لئے ہمارے نزدیک ہر وہ شخص جو اس مقصد کے حصول کی تائید کرتا ہے "حق" کا ساتھ دیتا ہے اور جو ایسا ہونے میں کسی پہلو سے بھی مانع ہے۔ ملّت کا بہی خواہ نہیں ہے۔ خواہ اس کا یہ طرزِ عمل نفسانیت پر مبنی ہو یا اس کی قوتِ فیصلہ کی غلطی پر۔ ملّت کے لئے نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔

اس مقام پر ایک بات اور بھی سامنے رکھنی چاہئے۔ ہمارے اس قسم کے مدعیانِ اصلاح ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ "مسلمانوں کی جماعت" کہلانے کا اُس کو حق ہے جو جماعت خالصۃً قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔ اور ان کی قیادت صرف اس کے لئے سزاوار ہے جو عمر فاروقؓ کا ثانی ہو۔

بلا شک و شبہ ایسا ہی ہونا چاہئے اور ہمارا بھی یہی ایمان ہے کہ مسلمانوں کو معراجِ کمال تک پہنچنے کے لئے اپنے سامنے ایک ہی نمونہ رکھنا چاہئے اور وہ نمونہ ہے " مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ " کا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ آج مسلمان جس "دَورِ جاہلیت" کی زندگی بسر کر رہا ہے کیا آپ توقع کر سکتے ہیں کہ پہلی ہی جست میں یہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے مشابہ ہو جائیگا ؟ اسے یہ تمام مراحل بتدریج طے کرنے ہونگے۔ اور جس قسم کا تمثیلی (Ideal) مسلمان اُسے ہونا چاہئے اس سطح تک پہنچنے کے لئے اسے مختلف ادوار سے گذرنا ہوگا۔ پہلا قدم اٹھانے کے بعد تو آپ ان کی حیاتِ جاہلیہ اور حیاتِ اسلامیہ میں حدِ فاصل بھی بمشکل قائم کر سکینگے۔ پھر ایک نبی کی تو یہ شان ہوتی ہے کہ وہ اپنی تربیتِ عالیہ سے ان مراحل کو برق رفتاری سے طے کرا دے۔ لیکن وہ مصلحین قوم جو خود اسی قوم میں سے ہونگے وہ تو ایسا معجزہ نہیں دکھا سکتے کہ رات کو آپ کی قوم "عہدِ جاہلیہ" کی زندگی میں سوئے اور صبح اٹھے تو قوم جنگِ قادسیہ کے مجاہدین کی شکل بن جائے اور اُن کا امیر عمر فاروقؓ کا ثانی۔

اس قسم کی نظری تعلیم سے ایک سخت نقصان یہ پہنچ رہا ہے کہ قوم کا نوجوان طبقہ اپنے اندر ضبط و انضباط (Discipline) اور جذبۂ اطاعت پیدا کرنے کے بجائے از سر تا قدم مجسم تنقید بن جاتا ہے۔ اور وہ اپنے نظریات کی جنتِ خیال میں ایسا گم ہوتا ہے کہ تمام انسان اس کی نگاہ میں عالمِ سفلی کے باشندے بن کے رہ جاتے ہیں۔ وہ نہ خود کچھ کرتا ہے نہ کسی کے کئے ہوئے کو خاطر میں لاتا ہے۔ اور یوں قوم کا وہ مفید عنصر، جسے ملت کے بازوؤں کی زندہ قوت بننا چاہئے تھا طلسم ہوشربا کے افسانہ کا ہیرو بن کے رہ جاتا ہے۔

---

(۲) سپاس نامہ سے قارئین کرام نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ بانیٔ تحریک پاکستان، انگلستان سے

واپس تشریف لا رہے ہیں۔ تازہ اطلاعات کی رو سے چودھری صاحب موصوف ۵ رفروری کو دہلی اور ۶ رکو لاہور پہنچیں گے۔ چودھری صاحب نے اپنے ۹ سال کے قیام انگلستان میں نہ صرف اپنے مقصد کی ہی عظیم الشان خدمت سرانجام دی ہے بلکہ علومِ مروجہ میں بھی اعلیٰ استعداد حاصل کی ہے۔ چنانچہ قانون۔ خطابت اور صحافت میں آپ کی قابلیت مُسلّم ہے۔ اور معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیلئے بھی انھوں نے اپنا تحقیقاتی مقالہ ایک یونیورسٹی کو بھیج دیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ سب چیزیں اضافی ہیں۔ اصل شئے تو وہ قلبِ سلیم اور ذہنِ رسا ہے جو فطرت کی کرم گستری سے چودھری صاحب کو عطا ہوا ہے۔ اور جسے حضرت علّامہ علیہ الرحمہ کے فیضِ صحبت نے قابلِ رشک جلا بخشی ہے۔ اللہ تعالیٰ ملّتِ اسلامیہ کو اِس ہونہار نوجوان کی خدمات سے مستفید ہونے کا پورا پورا موقع دے۔

(چودھری صاحب کی جو تصویر زینتِ دہ طلوعِ اسلام ہے۔ وہ بہت کچھ عرصہ پہلے کی ہے تازہ نہیں ہے)

*

(۳) ۲۸ رجنوری کی شام عربک کالج (دہلی) میں ہندوستان کے طالب علموں کا ایک مقابلہ کا مذاکرہ علمیہ (Debate) تھا۔ جس کا عنوان تھا کہ

"اِس ایوان کی رائے میں ہندوستان کی سیاسی گتھیوں کا حل صوبائی کی
تمدنی خطوط پر از سرِ نو تقسیم پر منحصر ہے۔"

کس قدر اہم عنوان اور کتنا جاذب یہ تصور کہ بزمِ مذاکرہ تمام ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے نمائندگان پر مشتمل ہے۔ لیکن وہاں جاکر ہمیں جس قدر صدمہ ہوا بیان سے باہر ہے۔ تمام ہال ایک کامل بدتمیزی کا مظاہرہ تھا۔ سیٹیاں۔ تالیاں۔ بیہودہ فقرہ بازی۔ حتیٰ کہ بازاری سطح کا استہزاء۔ یہ تھا وہ انداز جس سے مقررین کا استقبال ہوتا تھا۔ ہم یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور شرم سے زمین میں گڑے رہے تھے کہ یہ ہے مسلمانوں کا وہ نوجوان طبقہ جسے کل کو ملّتِ اسلامیہ بننا ہے۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون

اور سب سے زیادہ افسوسناک یہ امر تھا کہ اس ہڑبونگ میں کسی نے سُنا ہی نہیں کہ وہ طلبا جو دور دراز سے اس مذاکرہ میں شرکت کے لئے آئے تھے انھوں نے کیا کہا۔ مثلاً دیال سنگھ کالج (لاہور) کے ایک طالب علم کی پوری کی پوری تقریر جو ہمارے نزدیک نہایت سُلجھی ہوئی تھی۔ اسی طوفانِ بدتمیزی کی نذر ہوگئی۔

وقس علیٰ ھٰذا۔

ہم طالب علموں کے طبقہ کو ہمیشہ شفقت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور ان کے لئے ہمارے قلب کے عمیق ترین گوشوں میں ایک محبت بھرا احترام ہوتا ہے اس لئے ہم اس موقع پر جس تلخ نوائی کیلئے مجبور ہوئے ہیں وہ بھی درحقیقت اسی جذبۂ شفقت و رافت پر مبنی ہے کہ اس سے مقصود اصلاح ہے۔ تذلیل نہیں۔

کیا ہمارے یہ نوجوان بھائی اور ان کے اساتذہ حضرات اس پر توجہ فرمائینگے؟

---

(۴) اللہ کا شکر ہے کہ ہماری آہ رائگاں نہ گئی اور پنجاب میں بھی پراونشل لیگ متشکل ہو گئی۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ لیکن لیگ کی تشکیل کے ساتھ ہی وہاں کے بعض حضرات کی جدید لیگ سے علیحدگی کا اعلان اسی قدر افسوسناک ہے جس قدر لیگ کا قیام مسرت بخش۔ بایں ہمہ ہمیں امید واثق ہے کہ یہ اختلافات بہت جلد مٹ جائینگے۔ بشرطیکہ تخریب و انتشار کے اس "پردۂ زنگاری" کے پیچھے کسی معشوق کا ہاتھ نہ ہوا۔

---

(۵) ایک مثل ہے کہ "جو بولے وہی کنڈی کھولے" مسلمانوں کی آج یہی حالت ہے۔ چاہتے یہ ہیں کہ یہ تو چادر تان کر آرام سے لیٹے رہیں اور محض امیر کارواں کے چلنے سے تمام قافلہ منزل تک پہنچ جائے۔ ایک عرصے سے شور اٹھ رہا تھا کہ مسلمانوں کا اپنا پریس نہ ہونے سے قوم بالکل "بے زبان" ہو کے رہ گئی ہے۔ شور بہت تھا۔ لیکن عملی قدم کسی طرف سے نہیں اٹھتا تھا۔ بالکل تھک تھکا کر یہ بھی اسی اللہ کے بندے کو کرنا پڑا جو سیاسی کشمکش کے بحرِ متواج میں ہر مخالفت کے طوفان کا اکیلا مقابلہ کر رہا ہے۔ چنانچہ اطلاعات مظہر ہیں کہ مسٹر جناح کا کاٹھیاواڑ کا دورہ نہایت امید افزا مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ باقی ہندوستان میں اس کے متعلق کوئی تحریک نہیں۔ کوئی چرچا نہیں۔ ہر شخص یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ جس نے پہل کی ہے ساری ذمہ داری اسی کے سر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر صوبہ میں پریس فنڈ کھول کر روپیہ جمع کیا جائے اور جمع شدہ

رقوم مسٹر جناح کے پاس بھیج دی جائیں۔ انھیں اور بھی بہت سے کام ہیں۔ جب تک ہر صوبہ کے اربابِ بست و کشاد ان کے دست و بازو نہ بنیں گے کام کیسے چلیگا۔ بنگال اور پنجاب کی وزارتِ عظمیٰ کو اس وقت خاص طور پر ادھر توجہ دینی چاہئے۔

(بقیہ نقد و نظر از صفحہ ۸)

تفسیر سورۃ الشمس

مولانا حمید الدین صاحب فراہی رحمہ اللہ کا ذکر ان صفحات میں اس سے پیشتر آ چکا ہے۔ یہ ان صاحبِ نصیب برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جن کا سینہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغام کے حقائق سمجھنے کے لئے کشادہ کر دیتا ہے۔ آیاتِ قرآنی میں ربط اور ترتیبِ سُوَر میں نظم کی تلاش مولانا صاحب کا خاص موضوع تھا۔ اور اس باب میں وہ جو کچھ لکھتے تھے بڑی محنت و کاوش سے لکھتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ بالعموم عربی میں لکھتے تھے اس لئے عوام کو ان کے خیالات تک کی رسائی کا موقع نہ تھا۔ بارے ان کے شاگردِ رشید مولوی امین احسن صاحب نے اس خدمت کو اپنے ذمہ لیا۔ اور ان کی تفسیر کے اجزائے متفرقہ کا اُردو ترجمہ شائع کرنا شروع کر دیا۔ زیرِ نظر رسالہ سورۃ الشمس کی تفسیر کا اُردو ترجمہ ہے۔ اور مولانا صاحب مرحوم کی خصوصیات اور ترجمہ کی پوری خوبیوں کا حامل۔

تفسیر کے اخیر میں مولانائے مرحوم نے لکھا ہے کہ امتِ مسلمہ میں ناقۃ اللہ کی مثال حضرت علیؓ ہیں یہ چونکہ مولانا صاحب کے ذوق و وجدان کی چیز ہے اور تفسیر سے اس کا چنداں تعلق نہیں اس لئے اس باب میں اختلافِ نظر کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ تفسیر چھوٹی تقطیع کے ۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ ہے۔ اور ۵ر میں دفتر رسالہ اصلاح۔ سرائے میر اعظم گڑھ سے مل سکتی ہے مسلمانوں کو ایسی چیزوں کی قدر کرنی چاہئے تاکہ مولانائے مرحوم کی تفسیر کے دوسرے حصص بھی جلدی جلدی شائع ہو سکیں۔

بابُ المراسلات

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب اپنے مکتوبِ گرامی میں رقمطراز ہیں

"مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کے مجلہ "علیگڑھ میگزین (انگریزی)" نے حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کی یاد میں اپنا ایک خاص نمبر شائع کیا ہے مسلم طلباء کی یہ کوشش مستحقِ ہزار تہنیت ہے کہ انہوں نے اِس طرح عصرِ حاضر کی اُس بلند ترین ہستی کی یاد کو تازہ کیا جس نے اپنے پیغامِ حیات آفریں سے ملتِ اسلامیہ کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حضرتِ علامہ کی یاد تازہ رکھنے کا فریضہ بھی طلباء ہی کے ذمہ ہے کہ یہی نونہالانِ ملت ان کے پیغام کے حقیقی مخاطب ہیں۔ میں اِس وقت "اقبال نمبر" پر کوئی تنقید یا تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ اس میں ایک چیز ایسی ہے جس کو دیکھنے کے بعد میرا خیال ہے کہ ؎

اگر خاموش بنشینم گناہ است

اِس میں جناب غلام سرور صاحب۔ ایم۔ اے۔ کا مضمون بعنوان "اقبال کی شاعری کے چند گوشے" شائع ہوا ہے اس میں صاحبِ مضمون حضرتِ علامہؒ کی شاعری سے بحث کرتے کرتے اُن کے نظریۂ سیاست تک بھی جا پہنچے ہیں۔ جہاں جا کر وہ لکھتے ہیں کہ

"لیکن اُن کے (یعنی حضرتِ علامہؒ کے) سیاسی خیالات محلِ نظر ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ آخر کار فرقہ پرستی اور پان اسلام ازم (یعنی اسلامی بین الاقوامیت) کے گرویدہ ہو گئے تھے اگرچہ اس جرم کی سنگینی اس چیز کے پیشِ نظر کم ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اِن اصولوں کی تلقین اس وقت شروع کی جب انہوں نے دیکھا کہ دوسری قومیں اِسلامی مفاد پر جو حملے کر رہی ہیں ان کی وجہ سے اِسلامی دنیا کی ہستی خطرے میں ہے۔ اُن کے اِن خیالات کے جذباتِ محرکہ شکوک کی حد سے بالاتر ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان کے یہ خیالات زمانۂ حاضرہ میں کہاں تک قابلِ عمل ہیں۔ حکومت کے تمام موجودہ طریقوں کو ترک کر کے وہ

قرونِ اولیٰ کی اسلامی ہیئتِ اجتماعی کی طرف مائل ہو گئے جس میں حکمران کی ذات میں دینی اور دنیوی دو نو قسم کے اختیارات مجتمع ہوتے تھے۔ دنیا صدیوں کی کشمکش اور انتہائی کوششوں کے بعد سیاست اور مذہب کو الگ کرنے میں اس وقت کامیاب ہوئی جب کہ ان دونوں کا باہمی امتزاج محال نظر آ رہا تھا۔ اب یہ قریب قریب ناممکن ہے کہ رجعت قہقری کر کے ایک ہزار سال سے زائد کے گذرے ہوئے زمانے کے اس طرزِ حکومت کو زندہ کیا جائے جو کہ آزمایا جا چکا ہے اور دنیا جسے ناکارہ سمجھ کر مسترد کر چکی ہے۔ سیاسیات میں جذبات کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ نئے سیاسی اور مجلسی عقدوں کے حل کے لئے نئے ناخنِ تدابیر کی ضرورت ہے اور وہ سادہ اصول جو قرونِ اولیٰ کی اسلامی سوسائٹی میں رائج تھے بیسویں صدی کی پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لئے کارگر نہیں ہو سکتے جو لہر آگے بڑھ چکی ہے اس کو اب پیچھے نہیں دھکیلا جا سکتا۔ ان کے (یعنی حضرت علامہؒ کے) دل میں پرانی اسلامی روایات اور طرزِ حکومت کی جو عزت اور محبت ہے وہ ہزار قابلِ تعریف ہیں لیکن بدقسمتی سے اُن کی سکیم سے دنیا ایک عالمِ خیال کے (حسین) تصور سے زیادہ کچھ اور حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ خیالی طور پر جتنی اچھی معلوم ہوتی ہے اتنی قابلِ عمل نہیں ہے۔ ایک بہت بڑے مفکر ہونے کے باوجود وہ پرانی اسلامی روایات سے محبت کے جوش میں اس چیز کو بھول جاتے ہیں کہ مغلوب و مفتوح قوموں میں ظلم و استبداد سے جو ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے اس سے اُن کا چھٹکارا مشکل ہوتا ہے۔ صدیوں کی ذلت جمود اور بگاڑ کے بعد اُن کا اس فقید المثال پاکیزگیٔ نفس اور قوتِ عمل کے احوال و ظروف کی طرف لوٹنا ایک معجزہ کے ذریعے تو ضرور ہو سکتا ہے لیکن یہ کچھ انسانی امکانات کی حدود سے یقیناً باہر ہے۔ کچھ خاص چیزوں میں گو ہم اپنے آباؤ اجداد سے بہت اونچے چلے جائیں لیکن (بہمہ نوع) ہم ان کی مثل کبھی نہیں ہو سکتے۔ اُن کے سامنے نیکی اور پاکیزگی کے جو میزان تھے اُن پر اسی زمانہ میں ہی پورا اترا جا سکتا تھا۔ نئی نسلوں کی

نجات کے لئے نئے طریقے سوچنے کی ضرورت ہے"۔

"جناب سرور صاحب نے حضرتِ علامہ کے جس سیاسی نظریہ پر اعتراض فرمایا ہے۔ وہ اگر ان کا ذاتی نظریہ ہوتا تو سرور صاحب کے اعتراض کے خلاف ایسی شکایت نہ ہوتی کیونکہ کسی انسان کے خیالات کو تنقید کی حد سے بالاتر نہیں سمجھا جاسکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ سرور صاحب نے سمجھا ہی نہیں کہ جس سیاسی نظریہ پر انہیں اعتراض ہے وہ حضرت علامہ کا اپنا پیدا کردہ نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ قانونِ خداوندی ہے جو قرآن کریم کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ قرونِ اولےٰ کا وہ نظامِ سیاست جس کی رو سے مذہبی اور سیاسی اختیارات الگ الگ نہیں رہتے تھے بلکہ خلیفتہ المسلمین کی ذات میں مرتکز ہو جاتے تھے۔ اُسے اللہ تعالےٰ نے متعین کیا تھا اور حضور سرورِ کائنات نے اپنے اسوۂ حسنہ سے متشکل فرمایا تھا یہی دو ستون (کتاب اللہ اور اسوۂ حسنہ جو درحقیقت ایک ہی چیز ہیں) ہیں۔ جن پر اسلام کا قصرِ مشید قائم ہے اور جو صحیح معنوں میں تمام عالمِ انسانیت کا محور ہیں۔ حضرتِ علامہ نے اپنے پیغام میں نہ کوئی نیا فلسفہ اپنی طرف سے پیش کیا ہے نہ کوئی جدید نظریہ۔ بلکہ انہوں نے اس خالص اور منزہ اسلام کا احیا۔ کیا ہے۔ جو نبی اکرمؐ نے مسلمانوں کو دیا تھا۔ لیکن جو ہماری شوریدہ بختی سے عجمی تکلفات کے فریب نظر پردوں میں چھپ چکا تھا۔

"اس بحث میں اُلجھنا بیکار ہے کہ ایک مسلمان کی "فرقہ پرستی" اور "پان اسلام ازم" کی حقیقت کیا ہے اور آسے کس طرح دورِ حاضرہ کے پروپیگنڈہ نے نفرت انگیز لباس میں ملبوس کر رکھا ہے۔ لیکن سرور صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ حضرتِ علامہ نے مزعومہ "فرقہ پرستی" اور "پان اسلام ازم" کا مسلک خارجی محرکات کی بنا پر اختیار نہیں کیا تھا بلکہ جس "فرقہ پرستی" اور "پان اسلام ازم" کے وہ علمبردار تھے وہ عین اسلامی تعلیم کے مطابق تھا اور حقیقی اسلام کی محبت کا ہی وہ جذبہ تھا جس کے ماتحت انہوں نے اس مسلک کی اشاعت اپنا مقصدِ زندگی قرار دیا تھا۔

سرورؔ صاحب کے نزدیک اسلامی نظامِ حکومت (نعوذ باللہ) اس عہدِ کہن کی یادگار ہے۔ جس وقت دنیا نے ابھی اِس قدر ترقی نہیں کی تھی اور جس سے (یعنی اس نظام سے جس میں دینی اور دنیوی اختیارات ایک ہی ذات میں مرتکز ہو جاتے ہیں) چھٹکارا حاصل کرنے میں دنیا کو سینکڑوں برس تگ و دو اور کد و کاوش کرنی پڑی۔ اور انہیں افسوس ہے کہ اب جب خلقِ خدا نے ابھی اس "زنجیر" سے مخلصی حاصل کر کے "اطمینان کا سانس" لیا ہے۔ حضرت علّامہ ہم کو پھر اُسی نظام کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ سرورؔ صاحب کی تحریر کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اِسلامی اصولِ زندگی اور نظریاتِ حیات اپنے ماحول میں تو ٹھیک تھے لیکن وہ بڑھتے ہوئے زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اب مسلمانوں کو وہ نئے اصولِ زندگی اور نئے نظریاتِ حیات اختیار کرنے چاہئیں جو دنیا نے اتنی کد و کاوش کے بعد وضع کئے ہیں۔ اس دورِ تہذیب و تمدن میں عہدِ کہن کے نظامِ زندگی کی طرف عود ان کے نزدیک ایک دِل خوش کن لیکن ناقابلِ عمل خیالی دنیا کے پیچھے بھٹکنا ہے۔

"اللہ اکبر! یہ خیالات ہیں ایک ایسے شخص کے جس کا نام کم از کم یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسلام کا حلقہ بگوش ہے اس اسلام کا جس کے نزدیک اللہ تعالےٰ کا قانونِ ابدی قیامت تک کے لئے نافذ العمل ہے جو آج بھی اُسی طرح قابلِ عمل ہے۔ جس طرح آج سے چودہ سو برس پیشتر تھا۔ اور اس وقت تک قابلِ عمل رہیگا جب تک انسان کو حق و صداقت کی راہ کی ضرورت محسوس ہوتی رہیگی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ جزئیات و فروعات جو اسلامی قوانین کے اصولوں پر متفرع ہوتے ہیں۔ احوال و ظروف کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں اور انہیں بدلنا بھی چاہیئے۔ لیکن اسلامی نظامِ زندگی کے اصول ناقابلِ تغیر اور قوانینِ فطرت کی طرح اٹل ہیں۔ سرورؔ صاحب جس چیز پر معترض ہیں وہ کوئی فرعی مسئلہ نہیں بلکہ اصولی چیز ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص اسلام کے ایک ایسے مہتم بالشان اصول کو ناقابلِ عمل، زمانہ کا ساتھ نہ دے سکنے والا، اور عہدِ کہن کی یادگار سمجھتا ہے وہ (نعوذ باللہ) قرآن کریم کو قیامت تک کے لئے کافی نہیں سمجھتا۔

ملک میں الحاد و دہریت کی جو رَو بہ رہی ہے اُس سے ہمارے تجدّد پسند نوجوانوں کا طبقہ

بہت زیادہ متاثر ہو رہا ہے یہ خیالات کہ اسلامی نظامِ زندگی اب سے چودہ سو سال پیشتر۔ ایک خاص خطۂ ارض کے باشندوں کے لئے تو اچھا ہو سکتا تھا لیکن اب وہ ناقابلِ عمل ہے۔ اسی طبقہ کے دماغ کی پیداوار ہیں لیکن جس بات سے حیرت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری وہ درسگاہ جسے ہم "مسلم یونیورسٹی" کہتے ہیں۔ کم از کم وہ تو ایسے خیالات کی پرورش گاہ نہیں ہونی چاہیئے۔ سرور صاحب غالباً مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو جن اساتذہ کے یہ خیالات ہوں اُن کے طلباء جس قسم کی ذہنیت کے حامل ہونگے وہ بالکل واضح ہے ؎

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"

{جناب سرور صاحب غالباً نہیں بلکہ یقیناً مسلم یونیورسٹی میں (شعبہ انگریزی کے ریڈر) ہیں۔ ہمارے مکتوب نگار بھائی کو اُن کے اِن خیالات سے تعجب اس لئے ہوا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں تصور کئے بیٹھے ہیں کہ جو درسگاہ "اسلامی" ہونے کی مدعی ہے وہاں کے اساتذہ اور طلباء کے خیالات بھی اسلامی ہونے چاہئیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ ہمارے اِن اداروں کے ساتھ "مسلم" کا لفظ بھی ایسا ہی رسمی سا ہو کر رہ گیا ہے جیسا آج کل سرِ خطِ رسماً "۷۸۶" لکھ دیا جاتا ہے۔ خواہ نفسِ مضمون سراسر اس خدا کے خلاف ہی کیوں نہ ہو جس کے نام سے آغازِ تحریر ہوا ہے۔ ہمارے اس بھائی کا جذبۂ حمیت و غیرت جوش میں اسلئے آگیا کہ انہیں تفصیلاً علم نہیں کہ مسلم یونیورسٹی کے بعض مسند نشینانِ درس و تدریس کے دماغ کس کس قسم کے دہریت و لامذہبیت کے خیالات کی پرورش گاہ ہیں۔ اگر انہیں علم ہوتا تو وہ بھی ہماری طرح سب کچھ دیکھتے اور ایک آہ سرد کھینچکر کسی بھلے وقت کی انتظار کرتے جب قوم کے بازوؤں میں اتنی قوت آجائے کہ یا تو وہ ایسے مقامات سے "مسلم" کا مسلم فریب لیبل اتار دے یا انہیں صحیح معنوں میں مسلم بنا دے۔ قوت کے بغیر اصلاح کا خیال بھیک مانگنے کے مرادف ہوتا ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

طلوعِ اسلام}

کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی

مؤتمرِ آئین ساز

"للشیخ الفاضل"

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دُوں فطرتاں جوئی؟ — زموراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید !

گریزاز طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو — کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

ہندوستان کے طول وعرض میں آج (Constituent Assembly) کا راگ گایا جا رہا ہے۔ کانگریسی پریس جو درحقیقت ہندو قوم کا نفسِ ناطقہ ہے۔ ہر جگہ اس اسمبلی کی تعریف میں ڈھول پیٹ رہا ہے اور اُسے ہندوستان کی تمام سیاسی بیماریوں کا واحد اور شافی علاج بتلاتا ہو سیاسی حلقوں میں آج سے چند ماہ پہلے شاید ہی کسی نے ایسی اسمبلی کا نام سنا ہو، نہ کسی اخبار میں اسکا ذکر، نہ کسی انجمن اور جلسہ میں اسکا نام۔ نہ کسی پلیٹ فارم پر اسکا تذکرہ غرضیکہ تمام مُلک اِس سیاسی اصطلاح سے ناآشنا تھا کہ یکایک کانگریسی مہاتما کو القا ہوا۔ اور یہ سیاسی حربہ نہایت حسین پردوں میں ملبوس فلک کے سامنے رکھ دیا گیا تاکہ وہ مقاصد جو طاقت اور اکثریت عدم تعاون۔ عدم تشدد۔ مقاطعہ جُوئی وغیرہم کے ذریعہ حاصل نہ کر سکی اُسے اِس نئے ہتھیار سے پُورا کرے۔ عوام ابھی تک اِس نئے "اقدام" کے معنے اور اِس کے نتائج سے بے خبر ہیں، محدود دماغی وسعت رکھنے والوں کے علاوہ اچھے خاصے پڑھے لکھے افراد بھی انگشت بدنداں ہیں کہ اِس تمام شور وشغب کا کیا مقصد ہے! اور یہ مؤتمرِ آئین ساز کس نعمت کا نام ہے، جس کی تعریف میں ہندوستان کے اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ ہو رہے ہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ نقاب اُٹھ جانے کے بعد اس مزعومہ "مسیحائے قوم" کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے۔ اِس مختصر مقالہ کے پڑھنے سے قارئین کرام پر واضح ہو جائے گا کہ مؤتمر جسے ہندوستان کی موجودہ مشکلات کا حل بتایا جا رہا ہے کس طرح تمام اقلیتوں اور بالخصوص

مسلم اقلیت کی سیاسی زندگی کے لیئے زہرِ قاتل ہے۔ بیشتر اسکے کہ ہم ہندوستان کے نقطۂ نگاہ سے اس مؤتمر کے راز ہائے درون پردہ کا انکشاف کریں مختصر الفاظ میں اس کی اصلی نوعیت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سیاسی لغت میں مؤتمر قانون ساز Constituent Assembly " اُس غیر سرکاری مجلس یا اسمبلی کا نام ہے جو اس غرض سے بلائی جائے کہ وہ اُس ملک کے آئندہ سیاسی نظام کے متعلق ایک ایسا ضابطۂ حکومت مرتب کرے، جیسا اُس ملک کے سیاسی۔ ملی۔ معاشرتی تعلیمی اور تجارتی وغیرہ حالات کے پیشِ نظر تمام اراکین مؤتمر کو اتفاق ہو۔ اور وہ طرزِ حکومت اُن کی رائے میں اُس ملک کے لیئے بہترین ہو۔ یقیناً وہی طرزِ حکومت بہترین قسم کا ہوسکتا ہے، جس سے امنِ عامہ کو پورے اہتمام کے ساتھ قائم رکھا جاسکے جس سے ہر شہری امن کی زندگی بسر کرسکے؛ اپنے حقوق کو قائم اور اپنے مذہبی اور ملی وقار کو برقرار رکھ سکے؛ جسکے سامنے امیر اور غریب دونوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں اور جہاں اکثریت جبر و تشدد اور کثرتِ تعداد کے بل پر کمزور اقلیتوں کے طرزِ حیات میں سدِ راہ نہ بن سکے۔

سلطنتِ برطانیہ کی سیاسی تاریخ میں ایسی مؤتمریں وقتاً فوقتاً مختلف ممالک کے دستورِ سیاسی کو ترتیب دینے کے لیئے بلائی گئیں۔ مثال کے طور پر ۱۸۶۴ء میں کیوبک کانفرنس نے کینیڈا کی طرزِ حکومت کو ترتیب دیا جو چند ضروری ترمیمات کے بعد برٹش پارلیمنٹ میں منظور ہوکر برٹش نارتھ امریکہ ایکٹ کے نام سے نافذ ہوا۔ اسی طرح آسٹریلیا کے طرزِ حکومت کو مرتب کرنے کا فرض ۱۸۹۱ء میں آسٹریلین کنونشن نے انجام دیا۔ ۱۸۹۷ء میں بھی آسٹریلیا میں ایک ایسی جماعت تبلائی گئی جسنے سابقہ آئینِ حکومت میں مزید ردّ و بدل کرنے کا کام انجام دیا۔ اِس کنونشن نے ایک بل مرتب کیا جسے مسٹر چیمبرلین نے (جو اُسوقت سکریٹری آف اسٹیٹ تھے) منظور کیا۔ اور یہ بل کامن ویلتھ ایکٹ آف ۱۹۰۰ء کے نام سے مشہور رہا۔ کچھ سال بعد ۱۹۰۸ء میں جنوبی افریقہ کی چار (Colonial Parliaments) کلونیل پارلیمنٹوں نے مقام ڈربن پر ایک کنونشن یعنی کانفرنس بلائی جسنے ۱۹۰۹ء میں ایک بل مرتب کیا۔ یہ بل بعدہٗ دوسری کنونشن میں

جو بلومؔ فونٹین میں بلائی گئی۔ ترمیم کیا گیا۔ اور بعد میں "کنسٹی ٹیوشنٹ ایکٹ آف ساؤتھ افریقہ آف ۱۹۰۹ء" کے نام سے نافذ ہوا، اس جگہ یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہو کہ کینیڈا آسٹریلیا اور ساؤتھ افریقہ میں جو (Constituent Assemblies) بلائی گئیں ان کے ارکان کی تعداد نہایت قلیل تھی آسٹریلیا میں جو ۱۸۹۱ء میں نیشنل کنوینشن بلائی گئی۔ اس کے ارکان ۵۰ لوگ تھے جنہیں آسٹریلیا کی نوآبادیوں کی لیجسلیٹو اسمبلیوں نے منتخب کر کے بھیجا تھا۔ یہ نمائندے براہِ راست عوام کے بھیجے ہوئے نہیں تھے بلکہ انھیں اسمبلیوں کے ممبروں نے منتخب کیا تھا۔ علاوہ ازیں دستورِ سیاسی مرتب کرنے کا کام بھی فی الحقیقت کنونشن کی چھوٹی چھوٹی سب کمیٹیوں میں تقسیم کیا گیا۔

سلطنت برطانیہ کے باہر ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد متحدہ طاقتوں (Allied Powers) نے یورپ کی کئی ایک نئی اور پرانی قوموں کو اس امر کی دعوت دی کہ وہ رائے بالغانہ (Adult Sufferage) کی بنا پر Constituent Assembly بلائیں تاکہ وہ اُن قوموں کے لیے جدید طرزِ حکومت تجویز کریں۔ اسی طرح ۱۹۱۷ء میں جب بغاوتِ روس زوروں پر تھی اور یہ بغاوت تمام ملک میں لینن اور ٹراٹسکی ایسے لیڈروں کی قیادت میں ایک مہیب طوفان کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ ایک (Constituent Assembly) بلائی گئی جس کی نوعیت کا ذکر ایک مشہور انگریز مصنف اِن الفاظ میں کرتا ہے:

"Constituent Assembly جو رائے بالغانہ کی بنا پر بلائی گئی تھی۔ کسانوں اور کاشتکاروں کا ایک انبوہ تھا جو سمجھ دار اور تجربہ کار سیاستدانوں کے اثر و اختیار سے بالکل باہر تھا"

اس اسمبلی کے دوسرے بے شمار سخت گیر کارناموں کے علاوہ ایک مضحکہ خیز فیصلہ یہ بھی تھا کہ عین جنگ عظیم کے دوران میں سزائے موت منسوخ کر دی گئی!!!

حال ہی میں ہسپانیہ میں جب شاہ الفانسو کو تخت سے برطرف کیا گیا تو ایک نیشنل اسمبلی بلائی گئی۔ اس اسمبلی کے انتخاب کے لیے حقِ رائے وہی اُن تمام مردوں اور عورتوں کو دیا گیا۔ جن کی عمر تیئس سال سے اوپر تھی۔ اور الیکشن کی بنا یہ تھی کہ آیا ہسپانیہ میں ریپبلک (جمہوریت) ہو یا ملوکیت (Monarchy)

اِس الیکشن میں ریپبلک کے حامیوں کو بہت شاندار کامیابی ہوئی اور جولائی ۱۹۳۱ء میں ہسپانیہ کی اسمبلی (Cortes) کا پہلا اجلاس ہوا۔ اِس اسمبلی نے جو دستورِ حکومت مُرتب کیا۔ اُس میں اِس امر کا بھی اعلان کیا گیا کہ ہسپانیہ "ہر قسم کے مزدوروں کی ایک جمہوری ریپبلک ہے"۔ "حکومت سرکاری طور پر کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتی۔ اور رفاہِ عامہ کے لیے حکومت نجی جائیداد پر قبضہ کر سکتی ہے"۔ وغیرہ وغیرہ چنانچہ یہ دستور ترتیب پا رہا تھا۔ ہسپانوی لوگوں کو۔ جو ایک نہایت خود سر قوم واقع ہوئے ہیں اور جن میں سے ۷۵ فیصدی کم حیثیت کسان اور کاشتکار ہیں۔ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ اعلانات اور اُن اعلانات کے مطابق مُرتب کردہ قوانینِ مائل بہ اشتراکیت (Socialistic) اور خلافِ مذہب ہیں جو کسی طرح عام رائے دہندگان کے جذبات یا خیالات کا آئینہ دار نہیں ہو سکتے نتیجہ یہ ہوا کہ اِن قوانین کے خلاف ایک طرف دورِ سابقہ کے برسرِ کار اور صاحبِ اثر لوگوں کی طرف سے اور دوسری طرف کٹّر قسم کے انارکسٹوں کی طرف سے شدید مخالفت رونما ہوئی۔ نئی حکومت نے اپنے عہد کے آغاز ہی میں ایک "ایمرجینسی لاء" (وقتی قانون) نافذ کر دیا۔ جس کی رُو سے وہ بالکل مطلق العنان بن گئے۔ اِس حکومت کے کئی ایک کارناموں میں سے یہ بھی ہے کہ انہوں نے بہت بڑے بڑے مالدار زمینداروں کو اپنی جائیداد سے محروم کر دیا۔ مذہبی درسگاہیں بند کر دی گئیں اور اُن کی جگہ سرکاری مدارس کھولے گئے اور وہ بھی اسقدر ناکافی تعداد میں کہ اُن سے مُلک کی تعلیمی ضرورت بھی پوری نہ ہو سکی۔ مذہبی اِداروں کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی۔ اور تمام مذہبی علماء کو دینی تعلیم دینے سے روک دیا گیا اس قسم کے قوانین سے مُلک کے طول و عرض میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ اور ہر طرف سے مخالفت کے بادل اُمڈ آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اِس حکومت کو نومبر ۱۹۳۳ء کے جنرل الیکشن (انتخابِ عام) میں شدید شکست اٹھا کر برطرف ہونا پڑا۔

ہم اِس تمہید کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے۔ اِس سے اِس امر کا اظہار مقصود تھا کہ دُنیا میں مختلف زمانوں میں اور مختلف ممالک میں (حکومتِ برطانیہ کے اندر بھی اور باہر بھی) (Constituent Assemblies) بلائی گئیں۔ مگر یہ تمام اسمبلیاں اُن مُلکوں میں منعقد ہوئیں جنہیں عام اصطلاح میں "مغرب" کہا جاتا ہے۔ یا جہاں مغربی تہذیب کے گہوارے میں پرورش یافتہ یا مغربی سفید فام نسل کے لوگ بستے تھے "مشرق"

آجتک ایسی اسمبلیوں سے نا آشنا رہا ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اس کی مثال دُور بین لگا کر دیکھنے سے بھی نہیں ملتی۔ علاوہ بریں مندرجہ صدر اسمبلیوں کے حالات کا بتفصیل مطالعہ کرنے سے چند ایک اہم اُمور کا پتہ چلتا ہے:۔

اوّل:۔ یہ کہ بمجرد Constituent Assemblies کے انعقاد کے کسی ملک کے تمام سیاسی علل و عوارض کا علاج نہیں ہو جاتا۔

دوئم:۔ جہاں کہیں بھی کوئی دستور سیاسی کسی Constituent Assembly کے ذریعے مرتب کیا گیا۔ اس دستور کے مرتب کرنے کا کام چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے انجام دیا۔ اور باقیماندہ ممبر محض رائے دہی کے وقت ہاں یا نہ کرنے کا فرض ادا کرتے رہے۔

سوئم۔ اکثر و بیشتر اسمبلیاں ایسی ہوئی ہیں۔ کہ اُنکے ارکان وہ تھے جنہیں متعلقہ اور ملحقہ نو آبادیوں اور صوبہ جات کی اسمبلیوں کے ممبروں نے اپنے میں سے انتخاب کیا تھا۔ اور وہ براہ راست منتخب ہو کر نہیں آئے تھے۔

چہارم:۔ جس ملک میں پہلے قدامت پسندی کا دَور دَورہ ہو۔ اور وہاں رائے دہی کا حق ہر بالغ مرد اور عورت کو دے دیا جائے۔ جس سے تمام آبادی کا دو تہائی کم از کم نصف حصہ رائے دہندگان کی فہرست میں شامل ہو جائے تو ایسی Constituent Assembly کے بنائے ہوئے قوانین و آئین ایسے ہی ہوں گے جنکا نمونہ ہسپانیہ کے سلسلہ میں اوپر درج کیا جا چکا ہے

اس تمہید کے بعد اب ہم انڈین نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اس رزولیوشن کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں Constituent Assembly کے متعلق تجویز پاس کی گئی ہے۔ اس رزولیوشن کا ترجمہ ذیل میں درج ہے۔ اور یہ رزولیوشن ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو واردھا میں پاس ہوا۔

قومی مسئلہ کے آخری اور قطعی حل کے حصول کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ یعنی Constituent Assembly جسے کانگریس نے تجویز کیا ہے۔ اس تجویز کے ماتحت اقلیتوں کو جدا گانہ رائے دہی کے ساتھ پوری نیابت دینے کا معاملہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کانگریس کی جانب سے یہ پہلے ہی واضح

کر دیا گیا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا اقلیتوں کے حسب خاطر تحفظ کیا جائیگا۔ اور جہاں کسی بات میں اختلاف ہوگا وہ مسئلہ ایک غیر جانبدار عدالت (Tribunal) کے سامنے پیش کر دیا جائیگا"۔

کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے متعلق پہلا رزولیوشن دراصل الہ آباد میں پاس ہوا تھا۔ اور واردھا والے رزولیوشن میں اس اسمبلی کے متعلق دوبارہ اعادہ کیا گیا تھا۔ ۲۵ نومبر ۱۹۳۹ء کے ہریجن میں مہاتما گاندھی نے "ایک ہی راستہ" کے عنوان سے Constituent Assemblies کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ (۱) صرف Constituent Assembly ہی اِس مُلک کے لیے خالص سودیشی دستور مرتب کر سکتی ہے (۲) Constituent Assembly ہی ہمارے مذہبی اور دوسری بیماریوں کا علاج ہو سکتی ہے (۳) میں مسلمانوں کو الگ ووٹ دینے کا حق دونگا۔ مگر ہر ایک فرقہ ٹھیک اپنی تعداد کے تناسب کے لحاظ سے نیابت حاصل کریگا۔ (۴) اور ہندوستان کی سیاسی آزادی میں سب سے بڑی رُکاوٹ انگریزی حکومت ہے،

ان تمام باتوں کا فرداً فرداً جواب ہم بعد میں دینگے اُسوقت اُنکے ذکر کرنے سے صرف اتنا مقصود ہے کہ Constituent Assemblies کا صحیح مفہوم کانگریس کے ذہن میں کیا ہے۔ مسٹر راجہ گوپال آچاریہ سابق وزیر اعظم مدراس۔ جو کانگریس کے ایک بہت بڑے ممتاز لیڈر ہیں، اور جنہیں مہاتما گاندھی کے "ضمیر بردار" ہونے کی شہرت بھی حاصل ہے کے اُس بیان کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو انھوں نے ۳۰ نومبر ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں دیا۔ آپ نے ایک انٹرویو کے دَوران میں فرمایا کہ "جداگانہ رائے دہی خطرناک ہے۔ ضروری بات تو صرف اتنی ہے کہ کچھ تھوڑا سا تحفظ قائم کر لیا جائے۔ جداگانہ رائے دہی کے مقابلہ میں۔ خواہ اُسکے ساتھ کتنی ہی سیاسی قابلیت شامل ہو وہ مخلوط انتخاب۔ جسکے ساتھ نشستوں کا تعین کر دیا گیا ہو۔ اپنے اندر زیادہ تحفظات رکھتا ہے۔ جداگانہ انتخاب سے ناقابل توسیع اقلیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور چونکہ ہر پُرامن حکومت اکثریت کے ماتحت ہونی چاہیے۔ اِسلیے اِن ناقابل توسیع اقلیتوں میں بالکل علیحدگی اور بے تعلقی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے"۔ مہاتما گاندھی اور مسٹر راجہ گوپال آچاریہ کے مندرجہ صدر بیانات سے کانگریس کے حقیقی عزائم سامنے آجاتے ہیں، یعنی حکومت تو اکثریت ہی کے زیر اثر ہوگی، مگر اقلیتوں کو ایک "مجبوری مصیبت" (Necessary Evil) سمجھتے ہوئے تحفظ کے نام

سے کچھ دان کر دیا جائیگا۔

پیشتر اِسکے کہ ہم Constitnent Assembly کے حسن وقبح پر بحث کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہندوستان کی وسعت، آبادی اور مذاہب وغیرہ کے متعلق کچھ ذکر کریں۔ جس کے لیے Constituent Assembly تجویز کی جا رہی ہے، ہندوستانی اصلاحات کے سلسلے میں سلطنت برطانیہ کی مقرر کی ہوئی جائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ ۔ (حصہ اول) میں ان باتوں کا جامعیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔ وہ یہ ہے ۔

"ہندوستان کا یہ برّاعظم (برما کے علاوہ) جو ہمالیہ اور راس کماری کے درمیان واقع ہے ۱۵ لاکھ تیر ہزار مربع میل کو محیط کیے ہوئے ہے۔ اس کی آبادی ۴۰ کروڑ کے قریب پہنچ رہی ہے۔ اس رقبہ میں برطانوی ہند ۸ آٹھ ۷ ہزار مربع میل ہے اور ہندوستانی ریاستیں سات لاکھ مربع میل ۔ ان کی آبادی بالترتیب ۲۷ کروڑ اور آٹھ کروڑ ہے ۔ یہاں بہت سی نسلیں اور فرقے آباد ہیں جو بڑی بڑی بارہ زبانیں بولتے ہیں ۔ جس کے ساتھ دو سو سے زائد معمولی قسم کی بولیاں بولی جاتی ہیں ۔ یہ آبادی ایک دوسرے سے بلحاظ اصل (Origin) رسومات اور طرز حیات ایک دوسرے سے ایسی مختلف ہیں جیسے یورپ کی مختلف اقوام ۔ اس آبادی کا دو تہائی حصہ کسی نہ کسی شکل میں ہندو مذہب کی پیروی کا اقرار کرتا ہے ۔ ساٹھ کروڑ ستر لاکھ سے زیادہ اسلام کے پیرو ہیں ۔ اور ان دونو قوموں میں جو اختلاف ہے ، وہ فی الحقیقت محض مذہبی اختلاف ہی نہیں ۔ بلکہ قانون اور تہذیب کا اختلاف بھی ہے ۔ اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں قومیں دراصل قطعاً الگ الگ اور مختلف تہذیبوں کی نمائندہ ہیں ۔ . . . . آبادی کا اکثر حصہ زمین کی کاشت سے اپنی روزی حاصل کرتا ہے ۔ اور کاشتکاری کے ایک ایسے طرز کا پابند ہے جو فی نفسہٖ مکمل ہے اور اکثر و بیشتر پرانی وضع کا ہے ، اور اس مُلک کی جملہ دولت بے بہا ہے ۔ لیکن اس کی آبادی میں روز افزوں اور کثیر ترقی کے پیش نظر یہاں کے باشندوں کا معیار زندگی پست ہے اور یورپ کے کم از کم مہذب ملکوں کے ساتھ ان کا مقابلہ مشکل کیا جاسکتا ہے ۔ شہری علاقوں میں بھی تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب بہت کم ہے "

یہ ہے اُس ہندوستان کی حالت جس کے لیئے یورپ اور سلطنت برطانیہ کے دوسرے مُلکوں اور نوآبادیوں کی طرز پر Constituent Assembly کی دوائی تجویز کی جا رہی ہے۔ وہ ہندوستان جس کی صرف مسلمان آبادی ہی انگلینڈ، سکاٹ لینڈ۔ اور آئرلینڈ کی آبادی سے قریبًا دوگنا ہو جس میں کم و بیش ۱۲ بڑی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں، جہاں کی کل تعلیم یافتہ آبادی اندازاً آٹھ یا نو فیصدی سے زائد نہیں۔ اور جہاں کی بسنے والی دو بڑی قوموں کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے آئین حیات، فلسفۂ زندگی، زاویۂ نگاہ، ملی روایات، مذہب اور تہذیب کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور فی الحقیقت دو جداگانہ تمدنوں کی نمائندہ ہیں اِس مُلک کے عوارض کا علاج "بدیشی" دوائیوں سے تجویز کرنا۔ ع

کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری۔

یہ علاج نہ صرف اِس مُلک کے طبیعت اور مزاج کے ہی ناموافق ہے، بلکہ بدیشی ہونیکی وجہ سے خود کانگریس کے مطمح نظر کے بھی خلاف ہے۔ آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ جس مُلک کی تعلیم یافتہ آبادی تمام آبادی کا سات یا آٹھ فیصدی ہو اور پھر اُس آبادی کے کم و بیش پچاس فیصدی (یعنی بالغ مرد اور عورتوں) کو رائے دہی کا حق دے دیا جائے۔ تو وہاں کی Constituent Assembly کیا ہوگی اور اُس اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون کیا!

اب ہم ذرا حق رائے دہی کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ۱۹۱۹ء کی منٹو مارلے ریفارمز کی رُو سے ہندوستان میں اندازاً ۷۰ لاکھ مرد اور عورتوں کو رائے دہی کا حق دیا گیا تھا۔ یہ اُسوقت کی برطانوی ہند کی آبادی کا کوئی ۳ فیصدی حصہ تھا۔ سائمن کمیشن نے کل آبادی کا اندازاً ۱۰ فیصدی حقِ رائے تجویز کیا۔ اور اِس میں مرد اور عورت دونوں شامل تھے۔ ۱۹۳۲ء میں دوسری اور تیسری گول میز کانفرنسوں کے درمیان ایک Franchise Committee مقرر کی گئی۔ اور اُسکے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ایسی تجاویز پیش کرے جس سے سائمن کمیشن کے مجوزہ ۱۰ فیصدی نیابت میں اضافہ ہو جائے۔ مگر کل تناسب ۲۵ فیصدی سے زائد نہ ہونے پائے جیسا کہ پہلی گول میز کانفرنس میں منظور ہو چکا تھا۔ اِس کمیٹی کی رپورٹ کو چند ترمیمات کے بعد حکومت برطانیہ نے منظور کر لیا۔ اور یہ تجاویز بعدہٗ ۱۰ مارچ ۱۹۳۳ء کے وائٹ پیپر میں شامل کر دی گئیں۔ اِن تجاویز کی رُو سے

اندازاً ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ اور ۴ کروڑ ۹۰ لاکھ کے درمیان مردوں اور ساٹھ لاکھ کے قریب عورتوں کو رائے دہی کا حق دیا گیا۔ یہ تعداد تمام برطانوی ہند کی آبادی کا ۱۴ فیصدی ہے۔ اگر آج کانگریس کے رزولیوشن کے مطابق برطانوی ہندوستان کے ہر بالغ مرد اور عورت کو رائے دہی کا حق دیدیا جائے تو اسکا تناسب اگر زیادہ نہیں تو کم از کم ۶۰ فیصدی ضرور ہوگا یعنی موجودہ تناسب سے ۴ گنا زیادہ۔ گزشتہ الیکشنوں میں جہاں رائے دہی کا تناسب ۱۴ فیصدی سے زائد نہ تھا، جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ سب پر روشن ہیں۔ سنہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے ماتحت صوبہ جاتی اسمبلیوں کی نشستوں کے انتخاب میں جو ہڑبونگ مچا رہا ہے اور جس جہالت اور نا پختہ کاری کا مظاہرہ ہوتا رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر وہی نتائج اپنی برائیوں اور خرابیوں کے لحاظ سے آج چار گنا زیادہ کر دیے جائیں تو بدنظمی اور انتشار کا جو عالم ہوگا اُسکا صحیح اندازہ کرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ سنہ ۱۹۳۵ء کے انتخابات کے وقت کل رائے دہندگان کی تعداد قریب ۳ کروڑ تھی۔ لیکن ان میں سے ۵۰ء۵ فیصدی (یعنی قریب ڈیڑھ کروڑ) نے پولنگ اسٹیشن پر آکر رائے دی تھی اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ۱۴ فیصدی سے ۶۰ فیصدی تناسب زیادہ کرنے میں جو اندازاً ۴۶ فیصدی کا اضافہ ہوگا وہ خالص ان لوگوں کا ہوگا جو تعلیم سے قطعاً بے بہرہ اور جہالت کی گہرائیوں میں غرق ہوگا۔ فی الحقیقت یہ جاہل کسانوں اور کندہ ناتراشش مزدوروں کا ایک طوفان بدتمیزی ہوگا۔ جو نہ کسی ضابطہ کی پابندی سے واقف ہوگا اور نہ کسی آئین کی بندش سے آشنا۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس جہلِ مرکب کا بیشتر حصہ وہ لوگ ہوں گے جو قرنہا قرن سے توہم پرست اور مظاہرِ فطرت کو اپنا معبود سمجھتے چلے آرہے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک پیپل کا درخت بڑے سے بڑے عقل و بصیرت والے انسان سے زیادہ واجب التعظیم اور پتھر کا ایک ٹکڑہ بڑے سے بڑے متقی سے بڑھ کر سزاوارِ عزت و تکریم ہے۔ یقین مانیے کہ اگر یہاں کسی بڑے سیاستداں کے مقابلہ میں ایک سانڈ دیوتا بطور امید وار کھڑے کر دیے جائیں تو ہندوستان کی اس توہم پرستی سے کچھ بعید نہیں کہ یہ سانڈ دیوتا زیادہ آرا حاصل کرلے۔ یہ ہوگا وہ حلقہ رائے دہندگان جس کے انتخاب سے اس مجلس آئین ساز کا وجود عمل میں آئیگا۔ البتہ ایک بات بالکل واضح ہے، کانگریس کے مسلسل پروپیگنڈا نے عوام کے دلوں میں مسٹر گاندھی کو ایک مہاتما کی حیثیت دے دی ہے، ورنہ اگر نہیں

ایک دیوتا کی حیثیت سے پوجتے ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ انتخاب میں صرف وہی لوگ آسکیں گے جنہیں مہاتماجی کے بابِ عالی سے موزونیت کی سند عطا ہوئی ہو۔ اور اس باب میں مہاتماجی کے ظرف کی وسعتیں کیا ہیں اسکی حقیقت تری پوری کانگریس کے زخم خوردہ بوس کے دل سے پوچھیے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ عوام وہ ہونگے جنکے نزدیک ایک اچھوت کا سایہ موت کے فرشتے سے زیادہ بھیانک اور ایک ملیچھ مسلمان کا نام "یم دوت" سے زیادہ مہیب ہے۔ ان لوگوں کی آراء سے منتخب شدہ ممبروں کے ہاتھ میں ملک کی تقدیر دے دی جائے گی!!

لارڈ زٹلینڈ کے گزشتہ دو تین بیانات سے جو انہوں نے ہاؤس آف لارڈز میں دیے ہیں یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انگریزی حکومت ایسی Constituent Assembly کا نام تک بھی اپنی زبان پر لانے کو تیار نہیں۔ چہ جائیکہ وہ اس علاج سے ہندوستان میں خود اپنی ملی اور سیاسی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس سے آپ اندازہ فرمالیجیے کہ حکومتِ برطانیہ سے یہ کہنا کہ آپ ایک Constituent Assembly بلا دیجیے اور یوں خود تاج و تخت سے دستبردار ہو کر زمامِ حکومت ہمارے ہاتھوں میں دے دیجیے کس قدر مضحکہ انگیز ہے! اور کانگریس زعماء کے افلاسِ تدبر کا آئینہ دار۔ اگر ایک لمحہ کے لیے یہ تصور بھی کر لیا جائے کہ برطانوی پارلیمنٹ اپنے اختیارات سے علیحدہ ہونے کو تیار ہے (جو دراصل ناممکنات سے ہے) تو ہمیں دوسری منزل کا زائچہ لینا چاہیے جس سے ہمیں اسکے بعد گزرنا ہوگا۔ یہ تو بالکل واضح ہے کہ ہندوستان میں مغربی نمونے کی طرزِ جمہوریت قائم کی جائیگی۔ اب اسکے بعد سوچیے کہ حقائق ہمیں کس طرف لیے جاتے ہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان میں وہ شے جسے اصطلاحِ عام میں "وطن پرستی" کہا جاتا ہے۔ جغرافیائی حدود کی پابند نہیں۔ بلکہ وہ مذہب اور فرقہ داری کے ماتحت ہے۔ اس ملک میں کم و بیش سات جداگانہ مذاہب ایک ساتھ چل رہے ہیں جن میں سے دو بڑے مذاہب اسلام اور ہندو دھرم ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ "وطن پرست" نہیں۔ بلکہ "آفاق پرست" ہیں۔ اور جغرافیائی حدود کی چار دیواری ان کے جذبۂ اخوت و مودت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتی۔ ان کی یہ "آفاق پرستی" اس یک نگاہی اور یک جہتی کے ماتحت ہے۔ جو ایک مشترکہ دین کے پیرو، اور ایک خدا اور ایک رسولؐ کے نام لیوا ہونے کی

حیثیت سے اُن میں موجود ہے مشہور ہے کہ خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے مگر مسلمانوں کی حالت میں مذہب خون سے بھی زیادہ گاڑھا ہے۔ اسکا عملی ثبوت حج بیت اللہ ہے۔ جہاں ہر سال دُنیا کے دُور دراز گوشوں سے کم و بیش ۲ ہزار کلمہ گو ایک جا جمع ہوتے ہیں اور اُن تمام جغرافیائی حدود کو عبور کر کے آتے ہیں جو دیگر اقوام عالم کے نزدیک قومیت کی تشکیل کا موجب ہوتی ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے اس محسوس کر ہیں جبکہ مسلمان پیرو کے مسلمانوں سے اور یورپ کے سفید فام کلمہ گو افریقہ کے سیاہ رنگ حبشیوں سے بغلگیر ہوتے ہیں پھر جذبۂ اسلامی کا بے پناہ سمندر اپنی تمام حدبندیوں سے اُچھل کر ایک ہو جاتا ہے اور ملتِ اسلامیہ کی وحدانیت کا عملی ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اُس مذہب کے پیرو جو جغرافیائی حدود و قیود سے آزاد ہیں۔ جو گورے کالے کی تمیز سے بلند ہیں۔ وہ بھلا ہندوستان میں مغربی طرز حکومت کے مطابق کس طرح اپنے آپ کو مختلف علاقوں میں تقسیم کر کے اپنی یک آہنگی اور یگانگت کو برباد کر سکتے ہیں۔ مسلمان کے لیے بنگالی۔ پنجابی یا مدراسی ہونا ایک ثانوی شے ہے اسکے لیے باعثِ افتخار صرف ایک ہی بات ہے اور وہ یہ کہ وہ مسلمان کہلائے اور اول و آخر مسلمان سمجھا جائے۔ مسلمان کے نزدیک اِس بات میں کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ ہندوستانی ہے یا چینی۔ اُسکے لیے مسلمان ہونا ہی بس ہے۔ جس قوم کا یہ حال ہو اُسے جغرافیائی حدود والی طرز حکومت بھلا کس طرح راس آسکتی ہے۔ اور جب تک مسلمان مسلمان کی حیثیت سے زندہ ہیں وہ اپنے آپ کو مختلف خطوں میں تقسیم کر کے اپنے دلوں میں ملت کی تڑپ کی جگہ "وطنی پرستی" کا جذبہ نہیں ٹھونس سکتے اُنکے سامنے ہمیشہ تمام ملت کی بہلائی اور بہبود کا خیال قائم رہے گا۔ اور پیشتر اسکے کہ وہ کسی دستورِ سیاسی کو تسلیم کریں وہ دیکھیں گے کہ اس سے اُن کی ملی اور مذہبی آزادی بھی قائم رہتی ہے۔ یا نہیں اور کیا اُن کی ملی یگانگت مختلف خطوں کے اقتصادی اور سیاسی گورکھ دھندوں ہی میں تو ضائع نہیں ہو جاتی۔ مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ وطن پرستی کے قید و بند سے بالاتر ہے۔ اور اِسلیے مغربی طرز کی جمہوری حکومت جسکا انحصار وطن پرستی پر ہے۔ اور جو اُسے جغرافیائی خطوں میں تقسیم کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ مسلمان کے نزدیک کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

علاوہ بریں بالغانہ رائے دہی جو Constituent Assembly کا جزو لازم سمجھا

جاتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ فتنہ انگیز ہوگا۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ نظام حکومت آبادی کے شمار سے متعین ہوگا۔ اسے تفصیل سے یوں سمجھئے کہ مثلاً اگر ہر ۱ لاکھ ووٹر ایک ممبر منتخب کریں، تو کل ۱۰۰۰ ممبروں میں سے ۷۵۰ ہندو ہونگے۔ ۹۰ مسلمان۔ چھ عیسائی اور باقی مختلف تعداد میں دوسری قوموں اور فرقوں میں سے جب اس Constitnent Assembly کے اجلاس منعقد ہونگے تو یقیناً اسکے فیصلے کثرت آراء سے ہونگے اور ہندو اکثریت جو چاہے گی وہ اپنی کثرت آراء سے بلا شرکت غیرے خود منظور کرا لیگی پھر اس اسمبلی کے اندر جو اختلافات پیدا ہونگے وہ ایسے اختلافات نہیں جس طرح انگلستان کی مختلف پارٹیوں مثلاً کنسرویٹو لیبر یا لبرل وغیرہ کے درمیان ہوتے ہیں جو ایک ہی قوم کے مختلف الخیال لوگ ہیں بلکہ یہاں کے اختلافات کی نوعیت وہ ہوگی جو ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے درمیان ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان اور ایک تہذیب اور دوسری تہذیب کے درمیان ہوتے ہیں۔ اگر اختلافات کی یہی شکل ہوئی جسکا ہونا ناگزیر ہے، تو لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ۷۵ ہندو ووٹر دوسرے مذاہب اور فرقوں کے تمام ووٹروں کے مجموعے پر ہمیشہ ہمیشہ غالب رہینگے! اور یوں سوراج کے معنی خالص رام راج ہونگے اور ہندوستان کی تمام قومیں ہندو اکثریت کے رحم وکرم پر ہوں گی۔ کانگریس چاہے ہزار دعوے کرے کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرے گی۔ مسلمان آج ان دعوؤں سے مرعوب نہیں ہوسکتے۔ کانگریس کی گزشتہ سوا دو سالہ حکومت نے مسلمانوں کی مذہبی آزادی کو جس طرح برقرار رکھا۔ اسکا دستاویزی ثبوت مسلم لیگ کی پیرپور رپورٹ، اور مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال کی حال ہی میں شائع کردہ "کانگریسی فرد جرم" میں موجود ہے۔ جس سے معلوم ہوگیا کہ کانگریس کے گزشتہ پچاس سال کے بلند آہنگ دعاوی کس طرح حکومت اور سلطنت کے ان سوا دو سالوں میں تہس نہس ہوکر رہ گئے۔ یوں تو Constitnent Assembly کو ملک کے تمام عوارض کا علاج بتایا جا رہا ہے لیکن واقعات یہ بتاتے ہیں کہ اس سے اقلیتیں وہ کچھ بھی ہاتھ سے کھو بیٹھیں گی جو انہیں Communal Award کی رو سے حاصل ہے مثلاً مہاتما گاندھی نے یہ کہا ہے کہ Constitnent Assembly میں اقلیتوں کی نیابت ٹھیک اُن کی آبادی کے تناسب سے ہوگی جس حالت میں کہ اس طرح مسلمان اور دوسری اقلیتیں جنہیں ایوارڈ کے ماتحت ذرا زیادہ تناسب حاصل ہے

گاندھی جی کے اِس نہایت ہی شفقت آمیز اعلان سے مسحور ہو سکتی ہیں، مثال کے طور پر یوروپین فرقہ یک گوارا کر سکتا ہے کہ جو تناسب اُسے بنگال اور آسام کی اسمبلیوں میں اِس ایوارڈ کے ماتحت حاصل ہے اُسے چھوڑ کر اپنے آپ کو ایک ایسی جماعت کے رحم و کرم پر چھوڑ دے جس جماعت کی ورکنگ کمیٹی میں اُنکا ایک ممبر تک بھی نہیں۔ ہم گاندھی جی سے پُوچھتے ہیں کہ کیا کانگریس ورکنگ کمیٹی میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کا تناسب اسوقت بھی اُن کی تمام آبادی کے مطابق ہے یا کم؟ اِس سوال کے جواب کے بعد قارئین کو خود بخود کانگریس کے دعاوی کی صحیح حقیقت معلوم ہو جائیگی۔ اِس جگہ ہم قارئین کی توجہ اِس امر کی طرف بھی مبذول کراتے ہیں کہ کانگریس کے گزشتہ سوا دو سالوں کے عہدِ حکومت میں اڑلیسہ اور سی پی میں کتنے مسلمان ممبر کیبنٹ میں لئے گئے اور اسکے مقابلہ میں صوبہ سرحد اور سندھ کی وزارتوں میں جہاں ہندو اسی طرح اقلیت میں ہیں جس طرح مسلمان اڑلیسہ اور سی۔ پی میں، کتنے ہندو وزارت میں موجود رہے۔ کانگریسی زعما کی عملی کارگزاریاں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لیئے کافی سے زیادہ سبق آموز بن چکی ہیں۔ کہ وہ اب اِس جماعت سے بار بار فریب کھاتے رہیں۔

اب ہم ہندوستانی ریاستوں کا ذکر کرتے ہیں جنکے بغیر یہ مقالہ ادھورا رہ جائیگا۔ ہندوستانی ریاستوں کی آبادی آج کل ۴۰ کروڑ میں سے کم و بیش نو کروڑ ہوگی۔ کل ریاستیں تعداد میں اندازاً ۶۰۰ ہیں۔ ان میں سے ۱۰۹ ایسی ہیں (مثلاً حیدر آباد، میسور، بڑودہ، کشمیر، گوالیار، ٹراونکور وغیرہ) جنکے فرمانرواؤں کو چیمبر آف پرنسز میں ایک ایک نشست حاصل ہے، ۱۲۷ ریاستیں ایسی ہیں جنہیں مجموعی طور پر کل ۱۲ نشستیں حاصل ہیں، اور ۴۰۰ کے قریب معمولی قسم کی جاگیروں کے برابر جنکا کل رقبہ چند ایکڑوں سے زائد نہیں۔ اور وہ محض اس لیئے ریاستوں کے زمرے میں آتی ہیں کہ وہ برطانوی ہند کے علاقہ میں شامل نہیں۔ بڑی ریاستیں اپنے علاقوں کے اندرونی معاملات میں بالکل خود مختار ہیں لیکن اُنکے معاملاتِ خارجہ شاہِ انگلستان Paramount Power کے ہاتھ میں ہیں۔ دوسری ریاستوں کی اندرونی خود مختاری بھی ایک محدود درجہ کی ہے۔ اور ان میں اکثر و بیشتر تو ایسی ہیں۔ جہاں کی اندرونی حکومت بھی Paramount Power کے نام پر حکومتِ ہند انجام دیتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ Contituent

Assembly میں ان ریاستوں کو بھی نمائندگی دی جائیگی یا نہیں؟ کانگریس اس بارے میں ابھی تک خاموش ہے، ایک ثانیہ کے لیے ہم یہ تصور کر لیتے ہیں کہ انھیں نمائندگی دی جائے گی کیونکہ اگر ان ریاستوں کو شامل نہ کیا گیا تو اس برّاعظم کی تمام مجوزہ یگانگت اور وحدت زائل ہو جائیگی۔ اگر Constituent Assembly نے ریاستوں نوابوں اور راجاؤں کو شامل ہونے کی دعوت دی تو سب سے پہلے اُن کو پیرامونٹ پاور سے اجازت لینی ہوگی جسکے ساتھ انکا چولی دامن کا ساتھ ہے، اور جسکے ساتھ مختلف معاہدوں کی بنا پر اُنکے سیاسی وجود کی سلامتی قایم ہے۔ ذی ہوش افراد خود خیال فرما سکتے ہیں کہ اگر راجے مہاراجے کسی طرح کانگریس کے بلند بانگ دعاوی سے مرعوب ہوکر شمولیت کے لیے رضامندی کا اظہار بھی کر دیں تو پیرامونٹ پاور انھیں اس امر کی اجازت دیکر کس طرح اپنی شاہنشاہیت اور وقار کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ اگر بفرضِ محال کانگریس حکومتِ برطانیہ کو ریاستوں کے Constitnent Assembly میں شامل ہونے کے متعلق رضامند بھی کرلے تو ہندوستانی راجے خود شامل ہونے سے انکار کر سکتے ہیں۔ اور اگر Contituent Assembly اُن کی موجودگی کے بغیر ہی کوئی ایسا آئین حکومت مرتب کرے جو ریاستوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہو تو راجے مہاراجے اُس قانون کو تسلیم کرنے سے انکار کر سکتے ہیں۔ اسوقت کوئی ایسا قانون موجود نہیں جو راجوں مہاراجوں کو Constituent Assembly میں شامل ہونے پر مجبور کر سکے، یا بصورت دیگر اس اسمبلی کے بنائے ہوئے آئین کو اُنکے علاقوں میں نافذ کر سکے راجے مہاراجے اِس معاملہ میں قطعاً خود مختار ہیں اور پیرامونٹ پاور کے ساتھ اُنکا کوئی ایسا معاہدہ ر Treaty نہیں جس کی رُو سے خود پیرامونٹ پاور بھی دخل اندازی کرکے ہندوستانی راجاؤں کو اس قسم کے قانون کو تسلیم کرنے کے لیے مجبور کر سکے۔ اِس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ Constituent Assembly اُسی وقت اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اور تمام ہندوستان کے لیئے ایک واحد اور ہمہ گیر قانون نافذ کر سکتی ہے جب ہندوستانی ریاستیں بھی اس میں شامل ہوں جو اپنی آبادی کے لحاظ سے کل ہندوستان کی آبادی کا اندازاً چوتھائی حصہ اور بلحاظ رقبہ قریب قریب برطانوی ہند کے برابر دوسرے ہندوستانی ریاستیں اسی وقت

Constituent Assembly میں شامل ہو سکتی ہیں جب پیرامونٹ پاور بھی اُن کی شمولیت کے لیے رضامند ہو۔ کیونکہ ریاستوں کا تعلق براہِ راست پیرامونٹ پاور کے ساتھ ہے نہ کہ برطانوی ہند کی حکومت یا اسکے باشندوں کے ساتھ۔ اسلیے Constituent Assembly کی کامیابی کا انحصار اقلیتوں کے مسئلہ کے بعد ہندوستانی راجاؤں اور پیرامونٹ پاور کی رضامندی پر بھی ہے۔

اس بات کا جواب کہ یہ راجگان Constituent Assembly میں شمولیت کے لیے کہاں تک تیار ہونگے۔ خود کانگریس کی فردِ عمل ہی سے ڈھونڈھنا چاہیے۔ قارئین کی یاد سے راجکوٹ کا واقعہ ابھی تک محو نہیں ہوا ہوگا۔ کہ کس طرح گاندھی جی نے راجکوٹ کی پرجا پریشاد کو والیٔ ریاست اور اسکے وزیر اعظم مسٹر ویروالا کے خلاف بھڑکایا، جلسے کرائے جلوس نکلوائے ہڑتالیں کرائیں۔ پیرامونٹ پاور کے ایجنٹ کو ریاست کے باشندوں میں ذلیل کیا۔ وزیر اعظم کو کھلی کھلی گالیاں دیں۔ برت رکھا غرضیکہ ہر ممکن "مہاتمائی" حربہ استعمال کیا گیا۔ اور ازاں بعد فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس سے ثالثانہ فیصلہ لیکر خود قلا بازی کھا گئے اور اپنے جرم کا اقبال کر لیا کہ ہاں زیادتی میری تھی۔ علاوہ بریں کانگریس کی طرف سے ریاست ٹراونکور میں جو ریشہ دوانیاں آج ہو رہی ہیں۔ وہ بھی سب پہ روشن ہیں۔ انصاف پسند اصحاب خود اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کانگریس جو راجوں مہاراجوں اور پیرامونٹ پاور کو ہر ممکن طریق سے ذلیل کرنے کے درپے ہے اور اُنکے سر پر ایک عفریت کی طرح سوار ہے وہ کس طرح ان سے تعاون کی اُمید رکھ سکتی ہے۔

کانگریس نے اپنے رزولیوشن میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ:۔

"جہاں کسی بات پر اختلاف رائے ہو تو وہ مسئلہ غیر جانبدار عدالت (Tribunal) کے سامنے پیش کیا جائے"

پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنے بیان مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء کو جو انھوں نے لارڈ زٹلینڈ کے بیان کے بعد بمقام بمبئی دیا۔ یہ فرمایا:۔

"اگر کسی خاص مسئلہ کے متعلق سمجھوتہ نہ ہو سکے تو اُسوقت صرف ایک ہی مناسب طریقہ ہے کہ وہ معاملہ کسی آزاد ثالثوں کے سامنے پیش کر دیا جائے، مثلاً لیگ آف نیشنز یا لیگ کی

بین الاقوامی عدالت"۔

پنڈت جی ایسے ماہر سیاسیات سے اس قسم کے بیان پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ سلطنتِ برطانیہ کی سیاسی روایات سے کس قدر بے بہرہ ہیں۔ ابھی ۱۹۳۲ء میں لگانِ آراضی (Land Annuities) کے سلسلے میں آئرلینڈ کے وزیرِ اعظم مسٹر ڈی ولیرا نے انگریزی حکومت سے جھگڑا چھیڑا۔ برطانوی حکومت نے مسٹر ڈی ولیرا کو بہت سمجھانے بجھانے کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ وہ اس قضیہ کو ایک عدالت میں پیش کر کے فیصلہ کرالیں۔ اور اس عدالت کے جج صاحبان کا انتخاب قلمروِ برطانیہ کے مختلف علاقوں (Common wealth) میں سے ہو۔ ڈی ولیرا نے مطالبہ کیا کہ یہ معاملہ ہیگ کے بین الاقوامی کورٹ میں پیش کیا جائے۔ حکومتِ برطانیہ نے اس مطالبہ کو ٹھکرا دیا کیونکہ وہ کسی بین الدول Inter-Imperial معاملہ کو عدالت ہیگ میں پیش کر کے ایک غلط مثال کی بنا ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس واقعہ کے پیشِ نظر کانگریس کی تجویز کہ متنازعہ فیہ معاملات کسی بین الاقوامی عدالت کے سامنے پیش کیے جائیں۔ جسقدر بے معنی ہے قارئین اسکا خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ حکومتِ برطانیہ کبھی اپنے داخلی معاملات کا فیصلہ کسی غیر ملکی ادارے کے ہاتھ دینا گوارا نہیں کر سکتی۔ اگر اس اصول کو تسلیم کرے تو اُسے اِن قضیہ جات کو بھی عدالتِ ہیگ میں پیش کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑیگا جن میں وہ خود فریقین میں سے ایک ہو۔ مثلاً معاملہ فلسطین یا شمالی مغربی سرحدی صوبے میں پٹھانوں کا معاملہ جنہیں حکومتِ برطانیہ باوجود مسلسل کوششوں کے آج تک طے نہیں کر سکی۔ اس سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ کانگریس کی یہ تجویز حقیقت حالات سے بے خبری اور غالباً دانستہ چشم پوشی کا نتیجہ ہے۔

یہاں ہم ڈاکٹر آر۔ پی۔ پرنجاپی کے خطبۂ صدارت کا جو انھوں نے انڈین نیشنل لبرل فیڈریشن کے اکیسویں جلسہ منعقدہ الٰہ آباد میں ۲۷ دسمبر ۱۹۳۹ء کو دیا۔ ایک اقتباس درج کرتے ہیں تاکہ مسلمانانِ ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے خیالات کے بعد لبرل فیڈریشن کے نقطۂ نگاہ کا بھی علم ہو جائے۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیڈریشن اکثر و بیشتر ہندو اور پارسی سرمایہ داروں کی ایک انجمن ہے اور اسکے اراکین روشن خیال، مدبر، اور اعلےٰ سیاستداں سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر پرنجاپی صاحب فرماتے ہیں:-

Constituent Assembly پر مصر رہنا محض کم اندیشی اور معاملہ ناشناسی کے مترادف ہے۔ یہ اسکیم اعتراضات کی بوچھاڑ سے چھلنی کی جاسکتی ہے۔ اور اس پر بحث و تمحیص کرتے رہنے سے مزید دقتیں پیدا ہو جانے کا امکان ہے یہ بات کہنے میں نہایت ہی شاندار معلوم ہوتی ہے کہ ایسی اسمبلی کو بالغانہ رائے دہی کی بنا پر اکٹھا کیا جائے۔ لیکن کیا کبھی کسی نے ذرا سنجیدگی سے اِس امر پر بھی غور کیا کہ وہ ناتعلیم یافتہ دیہاتی جو رائے دہندگان کا ایک معتد بہ حصہ ہونگے۔ وہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کی حکومتی مشینری کے پیچ در پیچ مسائل پر اپنی رائے دینے کے قابل ہیں میرا خیال ہے کہ یہ بات زیادہ نامُلائم نہ سمجھی جائیگی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مسٹر گاندھی ایک ایسے طوفانی حملے کے ساتھ جس میں صداقت۔ اہنسا۔ چرکھا۔ دھرم۔ اچھوتوں سے میل ملاپ جیسے بلند آہنگ الفاظ اور اگر ضرورت پڑے تو اِسکے ساتھ ہی ہرن برت کی دھمکی سیاسی نعروں (Slogans) کی شکل میں استعمال کیے جائینگے جاہل ووٹروں کو اُنکے پاؤں سے اکھیڑنا چاہتا ہے۔ تاکہ اُن کی طرف سے اُسے ایسے سیاسی اختیارات حاصل ہو جائیں کہ اسکے بل پر وہ جو چاہے کر سکے۔ کیا یہ اغلب نہیں کہ ایسے طوفان سے فرقہ دارانہ فسادات رونما ہونگے جب تک کہ دوسری جماعتوں کے لیڈروں سے پہلے کوئی سمجھوتہ نہ کر لیا جائے بالغانہ رائے دہی کی اسکیم میں پہلے ہی سے کئی ایک ترمیمیں ہو چکی ہیں یعنی یکہ اقلیتوں کو اِس اسمبلی کے انتخابات میں جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائیگا۔ مگر اسکے ساتھ پاسنگ (Weightage) کے معاملہ کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ مہمل شکل میں رکھا گیا ہے۔ ہندوستانی ریاستوں کی نیابت کے سوال کو چھوا تک بھی نہیں گیا۔ اِس امر پر بھی کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا گیا کہ اُن پارٹیوں کو جو بلحاظ رائے ایک الگ حیثیت رکھتی ہیں اور جو سوگاؤں (وارادھا) کے شوالے کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتیں اِس اسمبلی میں کیا نیابت حاصل ہوگی۔ علیٰ ہذالقیاس کئی ایک دیگر مسائل کو آئندہ کے لیے اُٹھا رکھا گیا ہے، تا کہ ان کے متعلق مہاتما جی کی اندرونی روشنی اپنے اظہار کی تقریب پیدا کر لیا کرے بقول مسٹر گاندھی اِن مسائل میں سے اکثر ایسے ہیں جن کا فیصلہ اوائل ہی میں مختلف جماعتوں کے لیڈروں کی باہمی مشاورت سے کیا جائے گا۔ یا

گورنمنٹ سے کوئی فیصلہ حاصل کیا جائیگا (ملاحظہ ہو) وہ گورنمنٹ جسکے وجود ہی کو نیست و نابود کر دینے کا تہیہ ہو اگر Constituent Assembly جیسے اہم ابتدائی اور بنیادی نقاط پر چند لیڈروں کی باہمی مشاورت سے یا حکومت کی مشفقانہ امداد کے ذریعہ سے اتفاق ہو جانا ممکن ہے تو پھر ایسی مشاورت سے یہاں کی طرزِ حکومت کے تمام مسائل کو طے کر لینے پر کیا اعتراض ہے۔ اگر یہ باہمی گفت و شنید ایک معاملہ میں کامیاب ہو سکتی ہے تو اسکے دوسرے مسائل میں کامیاب ہونے میں کیا چیز حائل ہے۔ مجھے اس جگہ اس بلند عزم کیمیاگر کا خیال آتا ہے جو ایک ایسا مرکب دریافت کرنا چاہتا تھا جس میں ہر ٹھوس چیز حل ہو جائے۔ جب ایک سادہ لوح آدمی نے اُس ماہر کیمیاگر سے یہ پوچھا کہ پھر وہ اُس مرکب کو کس برتن میں ڈال کر رکھے گا تو وہ شش و پنج میں پڑ کر رہ گیا۔ کیا یہ حقیقت سے بعید ہوگا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مسٹر گاندھی اُسی دوا ساز کی مانند ہے جو اپنی بلند پروازی میں عملی رکاوٹوں کو بھول جاتا ہے تمام Constituent Assemblies. کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ کامیاب ہوئیں وہاں ابتدائی منازل تمام لیڈروں کے مابین باہمی گفت و شنید سے پوری طرح سے طے کر لئے گئے تھے اور جب یہ ابتدائی یکجہتی مکمل طور پر حاصل ہو گئی۔ اور اس کے بعد اگر یہ ضروری سمجھا گیا تو Constituent Assembly کے ذریعے سے (بشرطیکہ اُسکا بُلایا جانا ممکنات میں سے ہو) اُن طے شدہ امور پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی گئی۔“

”اسکے برعکس ایسی بلند پرواز سکیموں سے اکثر شدید قسم کے اختلافات اور تنازعات پیدا ہو گئے اور متعدد بار اُن سے کچھ بھی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا جیسا کہ بغاوتِ فرانس کے وقت۔ میرے خیال میں ہمارے لیڈروں کیلئے سب سے مناسب طریق کار یہ ہوگا کہ وہ اُس راستے پر چلیں جس پر چلکر اگرچہ انہیں انجام کار ناکامی ہوئی تھی مگر وہ بظاہر بہت اُمید افزا۔ میری مُراد ہے کہ وہ ایک غیر رسمی اور قابلِ انتظام مختصر سی ایسی کانفرنس میں باہم اکٹھے ہو جائیں جنہے نہرو رپورٹ کو ترتیب دیا تھا۔ شاید ہے کہ پنڈت جواہر لال بھی اپنے باپ کی بیاض میں سے ایک ورق لینا گوارا کرے۔“

اب آپ نے خود ایک ہندو جماعت کے صدر کی زبانی Constituent Assembly کی

تعریف سُن لی اور یہ بھی سُن لیا کہ ایسی اسمبلی سے کیا نتائج رونما ہونگے۔ یعنی اگر اسمبلی میں ہندو ہی کا شمار ہوگا، اگر ایسا نہ ہوا تو اُس اسمبلی کی حقیقت ہی کچھ نہیں، تو پھر اقلیتوں کی ہستی بے معنی ہوگی۔ اور انکی موجودگی بے اثر، مہاتما گاندھی چاہے کتنا ہی کہیں کہ فرقہ وارانہ کش مکش کی وجہ سے ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا، مگر کوئی ذی ہوش انسان ہندوستان کی موجودہ سیاسی کش مکش میں فرقہ وارانہ خوف کے عنصر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ دُنیا کی کوئی طاقت بھی ہندوستان کے مختلف فرقوں، قوموں اور مذاہب کو ہموار نہیں کر سکتی جس سے تمام فرقہ وارانہ اختلافات کا وجود یک قلم نیست و نابود ہو جائے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر ہندوستان کی سیاسی بیماری کا ایک ہی علاج ہے یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعتوں یعنی کانگریس اور لیگ کے نفوسِ ناطقہ پر مشتمل ایک مجلسِ مفاہمت جس میں کسی قوم کی قوت کا اندازہ سروں کے شمار پر نہ ہو۔ بلکہ اِن ہر دو اقوام کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ اِس ضمن میں ہمارے سامنے مجلسِ اقوام کی مثال ہے، جہاں ہر ممبر حکومت کا حقِ رائے دہی مساوی ہے، چاہے انکی آبادی میں کتنا ہی تفاوت ہو۔ مثلاً اِس مجلسِ اقوام میں وسطی امریکہ کے ایک چھوٹے سے علاقہ Costa Rica "کوسٹاریکا"⊕ کو جسکا طول و عرض مشکل سے ۲۰۰ میل اور ۱۰۰ میل ہوگا وہی حقِ رائے دہی حاصل ہے جو فرانس⊕ جیسے عظیم الشان مُلک کو۔ اِسی طرح ہندوستان میں کسی مجلسِ آئین ساز میں مختلف قوموں کی نیابت کا انحصار اُن کی آبادی کے اعداد و شمار پر نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ اُنکے علیحدہ وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اُمورِ سلطنت میں اُنکا اثر اور حق مساوی ہونا چاہیئے۔ تاکہ کوئی زیادہ آبادی والی قوم محض اپنی آبادی کی کثرت کے باعث دوسری کم آبادی والی قوم پر غالب نہ آسکے جس سے اس کی انفرادی حیثیت میں کسی قسم کی دخل اندازی ہو۔ بنابریں ہندوستان کی موجودہ کش مکش کا علاج کانگریس کی پیش کردہ Constituent Assembly نہیں ہو سکتا جو اقلیتوں کے بارے میں مختلف النوع خطرات سے پُر ہے، جسے نہ لبرل پسند کرتے ہیں اور نہ ہندوستانی ریاستیں تسلیم کرنے کو تیار ہوں گی۔"

یہاں یہ امر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے عندیہ سے بھی قارئین کو آگاہ کیا جائے

⊕ آبادی۔ کوسٹاریکا = ۵ لاکھ۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ مستند اور واضح بیان وہ ہے جو والسرائے ہند نے بمبئی کی اورینٹ کلب

Orient Club میں مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۳۹ء کو اپنی تقریر کے دوران میں دیا۔ اس

تقریر کا ایک مختصر اقتباس ذیل میں درج ہے۔

"حاضرین میں جانتا ہوں کہ آپ والسرائے اور حکومت برطانیہ کی پوزیشن کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو انہیں پُر زور اور متضاد مطالبات کی وجہ سے درپیش ہیں جو ایسے سیاسی اداروں اور سیاسی عناصر کی طرف سے پیش کیے جا رہے ہیں اور جن کی سیاسی اور ملی حیثیت پورے پورے غور و فکر کی مستحق ہے، مختلف پارٹیوں میں بالضرور انصاف ہونا چاہیے اور حکومت برطانیہ نے بھی اس امر کا عزم صمیم کر لیا ہے کہ انصاف ضرور ہو گا لیکن میں اپنے دوستوں سے جو مختلف پارٹیوں میں ہیں، یہ دریافت کروں گا کہ کیا وہ باہم یکجا نہیں ہو سکتے اور اپنے درمیان ایک ایسا متفق علیہ فیصلہ نہیں کر سکتے جس سے میرا اور حکومت برطانیہ کا کام آسان ہو جائے جو انھیں ہندوستان کے آئندہ دستورِ سیاسی کے نازک مسئلے کے متعلق درپیش ہے اور میں پھر اس امر پر زور دینے کی جسارت کرتا ہوں کہ باہمی سمجھوتہ کر لیا جائے تاکہ اُن مسائل کی گتھی سلجھنے کا راستہ زیادہ ہموار ہو جائے جن سے ہم آج دوچار ہیں۔"

"جہاں تک مطمح نظر کا تعلق ہے وہ بالکل واضح ہے۔ میں ہر اُس عملی تجویز پر غور کرنے کے لیے تیار ہوں جس پر سب کو اتفاق ہو۔ اور وقت آنے پر میں ہر ممکن مدد دینے کے لیے تیار ہوں۔ جو میں ذاتی طور پر دے سکتا ہوں حکومت برطانیہ اُن عملی مشکلات کی طرف سے جو موجودہ سیاسی نظام تک جسے ڈومینین سٹیٹس (درجہ نوآبادیات) کہتے ہیں ایک ہی قدم میں پہنچنے میں پیش آئیں گی اُن سے غافل نہیں اور نہ ہی ہم یہاں اُن سے ناواقف رہ سکتے ہیں لیکن یہاں میں پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انھیں اور مجھے یہ فکر دامنگیر ہے کہ ہم اُس عرصے کو جو موجودہ دستورِ سیاسی اور درجہ نوآبادیات کے قائم ہونے تک گزرے گا جس قدر بھی ممکن ہو سکے کم کرنے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھیں، ہماری طرف سے پیشکش

آپ کے سامنے موجود ہے۔"

حکومتِ برطانیہ کا عندیہ صاف اور واضح ہے کہ پہلے مختلف پارٹیوں کے لیڈر ایک متفقہ علیہ فیصلہ پر پہونچنے کی کوشش کریں اور جب ایسا سمجھوتہ حاصل ہو جائے تو اُسے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کر دیا جائے دوسرے الفاظ میں پہلے اہم مسائل کا باہمی فیصلہ کر لیا جائے اور ازاں بعد اُسکے مطابق ایک دستورِ سیاسی کو مرتب کر لیا جائے، یہ نہیں کہ دستورِ سیاسی وضع کرنے کے لیے Constituent Assembly تو پہلے بُلائی جائے مگر متنازعہ فیہ اُمور کا فیصلہ اُسکے بعد کیا جائے اس ضمن میں لنڈن کے مشہور اخبار "ٹائمز" کے مقالۂ افتتاحیہ میں سے ایک اقتباس بے محل نہ ہوگا۔ یہ مقالہ نومبر ۱۹۳۹ء کے آخری یا دسمبر ۱۹۳۹ء کے پہلے ہفتہ کی دوران میں شائع ہوا۔ لکھا ہے:۔

"جب ہندوستان کے مختلف سیاسی عناصر اس دستورِ سیاسی کے متعلق متفق ہو جائیں جسکے ماتحت وہ رہنے کے لیئے تیار ہیں اُسوقت اُس مُلک کو محض اِس معمولی سی بات کی بنا پر ڈومنین سٹیٹس حاصل ہو جائیگا۔ کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں نہ تو یہ طاقت ہوگی اور نہ ہی اسکی یہ خواہش ہوگی کہ وہ متفقہ علیہ مطالبہ کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالے یا اُسے مسترد کر دے۔"

گذشتہ چند ماہ کے دوران میں اور بالخصوص موجودہ جنگ کے آغاز سے حکومت برطانیہ اور انگلستان کے اخباروں نے پے در پے اِس امر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ہندوستان کے سیاسی مطالبات تسلیم کرنے کے لیئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ ہندوستان کی مختلف جماعتیں مختلف فرقے اور مختلف سیاسی عناصر پہلے آپس میں کسی ایک سمجھوتہ پر متفق ہو جائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کا لائحہ عمل اِس سے بالکل مختلف ہے، بلکہ یوں کہیئے کہ بالکل الٹ ہے اگر کانگریس اپنے عزائم اور دعاوی میں واقعی ایماندار ہوتی تو وہ اپنے تجویز کردہ طریق کار پر اسقدر ضد اور اصرار سے کام نہ لیتی۔ اور اپنی صداقت کے ثبوت میں اُسوقت دستِ تعاون بڑھا دیتی۔ جب وائسرائے نے جناب جناح اور مسٹر گاندھی کو بُلا کر اپنے اختلافات کو نظر انداز کر کے ایک سمجھوتہ پر پہونچنے کی دعوت دی تھی۔ اس زرّیں موقع کو ہاتھ سے کھو دینے کی تمام تر ذمہ داری کانگریس پر عائد ہوتی ہے، جسنے مسلم لیگ کو واحد اسلامی نمائندہ جماعت ماننے سے انکار کر کے

ہندوستان کی سیاسی ترقی کو ایک نامتعین عرصہ کے لیئے پس پشت ڈالدیا۔

کانگریس کو اب بھی حقائق سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیئے۔ دُنیا خوب جانتی ہے کہ کانگریس ایک ہندو جماعت ہے، اور اس میں دوسری قوموں کا جو حصّہ ہے وہ بالکل ناقابلِ ذکر ہے۔ مسلمان بحیث القوم آغاز ہی سے اس میں جذب نہیں ہو سکے جسکا سب سے بڑا باعث ہندو قوم کی اکثریت ہے جسکی وجہ سے جس بات کو وہ چاہتے ہیں اپنی کثرتِ آراء سے منظور کرا لیتے ہیں، چاہے اس میں دوسری قوموں کی حیاتِ ملیہ پر کتنی ہی زد کیوں نہ پڑتی ہو۔ اس سلسلے میں بندے ماترم کا دل آزار گیت اور وردھا کی تعلیمی اسکیم ہمارے سامنے ہیں، اسلیئے اگرچہ مسلمان وقتاً فوقتاً اس جماعت سے تعاون بھی کرتے رہے اور اسکے ممبر بھی بنتے رہے مگر یکے بعد دیگرے کانگریس اکثریت کے طرزِ عمل اور طریقِ کار سے دل برداشتہ ہو کر علیحدہ ہوتے چلے گئے اور اب تو صرف وہی انکے ساتھ رہ گئے ہیں، جنکا اور کوئی ٹھکانہ نہیں! کانگریس کو اب اپنی کمزوریوں کا احساس کرنا چاہیئے اور ذرا چشمِ بصیرت سے اپنے آپ کا زائچہ لینا چاہیئے کہ کیا اُسے مسلمانوں کی نمائندگی حاصل ہے اگر نہیں تو اُسے اس فضول دعوے کو کہ وہ ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے ترک کر دینا چاہیئے تاکہ ہندوستان کی سیاسی ترقی میں جو سب سے بڑا سنگ راہ ہے۔ دُور ہو جائے۔ جس روز اسنے اس صداقت کو تسلیم کر لیا۔ ہندوستان کی مشکلات کا خاتمہ ہو جائیگا۔ مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ طاقت کا وہ نشہ جو گزشتہ ۲۸ ماہ کی حکومت سے اُسکے دماغ کو بدمست کر چکا ہے اُسکا اب آسانی سے اُترنا مشکل ہے اس نشے کے زیرِ اثر کانگریس اپنے ہر قول و فعل اور اپنی سیاسی تجاویز کو تمام فرقوں اور جماعتوں کے لیئے یکساں مفید سمجھنے پر مُصر رہے گی۔ اور یوں ملک کی غلامی کی زنجیر دن کو مضبوط تر کرتی چلی جائیگی۔

اس مضمون کو ہم قائدِ ملت جناب جناح کے الفاظ میں ختم کرتے ہیں، یہ الفاظ اُنکے اہم بیان سے لیئے گئے ہیں جو انھوں نے Contituent Assembly کے سلسلے میں مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں دیا:۔

"مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ کیا ہی اچھا ہو اگر مہاتما گاندھی اپنے خیالات کی فضول نمائش چھوڑ دیں۔ ایسے خیالات جو روز بروز اور ہفتہ بہ ہفتہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور جنمیں

اگر کسی چیز کو ثبات ہے تو وہ اُن کا باہمی تضاد و تخالف ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ اپنی تمام توجہ صرف ایک ہی مسئلہ پر مرکوز کر دیں۔ یعنی ہندو مسلمان مسئلہ کے سلجھانے میں، کیونکہ تمام کانگرسی لیڈروں میں سے وہی ایک ہیں جو بوجوہِ احسن ہندو قوم کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ اور ہندوؤں کی طرف سے سمجھوتہ کر سکتے ہیں اور یہاں دو بڑی جماعتوں میں یگانگت اور اتفاق پیدا کر سکتے ہیں۔ اور جب یہ ہو گیا تو دوسری باتیں خود بخود صاف ہو جائیں گی مجھے اِس امر کا اعادہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کی طرف سے میں اِس باعزت سمجھوتہ کے حصول کے لیئے اپنی تمام طاقت وہمت کے ساتھ مدد کرنے میں تیار رہوں گا۔

بہتر ہو کہ جس نقطہ سے ہم نے آغازِ مضمون کیا تھا اسی پر آکر یہ دائرہ ختم ہو جائے ؎

غُلامی فطرتِ آزاد را رُسوا مکن
زاشی خواجۂ از برہمن کافر تری

ہے وہی سازِ کُہن مغرب کا جمہوری نظام
جسکے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

مجلسِ آئین و اِصلاح و رعایات و حقوق!
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اس سرابِ رنگ و بُو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو (اقبالؔ)

عقل و عشق

(اسد ملتانی)

خیال کو بھی اسیرِ نگاہ کرتا ہے مری نظر میں مصوّر گناہ کرتا ہے

نہیں ہے سوزِ غمِ عشق کی جھلک جس میں وہ نُورِ عقل بھی دِل کو سیاہ کرتا ہے

اگرچہ عقل بھی کرتی ہے آرزو پیدا یہ عشق ہے جو اسے بے پناہ کرتا ہے

خُدا کے واسطے اپنی خودی نمایاں کر کہ خود خُدا تجھے اپنا گواہ کرتا ہے

نگاہِ بندۂ مومن سے بھی وہ ہے ممکن جو کام شاہ بزورِ سپاہ کرتا ہے

وہ یہ سمجھ کے مری آہ سے ہیں بے پروا کہ جس سے بن نہ پڑے کچھ وہ آہ کرتا ہے

ہے شیخ شہر اسی بات پر اسدؔ سے خفا

کہ یہ مخالفتِ خانقاہ کرتا ہے

موجودہ سیاسی کشمکش اور ملت کے علماء

(قسط دوم)

اس مضمون کی قسط اول میں ہم بتا چکے ہیں کہ علمائے سوء نے ہر دور میں ملتِ اسلامیہ کی تخریب و تذلیل کے لیے، مذہب کا نقاب اُوڑھ کر کیا کیا حربے استعمال کئے اور گلشنِ اُمت کو کس طرح تاخت و تاراج کیا ہے پھر ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں وہ "علم و فضل" جس کی تحصیل کے بعد یہ حضرات جناب رسالتمآبؐ کے جانشین بننے کے مُدعی ہوتے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ یعنی وہ عام طور پر، انہی حضرات کے الفاظ میں "یونانیت و عجمیت کے خرافات" کا مجموعہ ہے، جسے کتاب و سنت سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ علم دین میں ان حضرات کی بالعموم یہ حالت ہے۔ اور دوسری طرف علوم دُنیوی کی یہ کیفیت کہ یہ لوگ اپنے زمانہ کے کوائف و احوال سے باخبر ہونے کے لیے بھی دوسروں کی ترجمانی کے محتاج ہوتے ہیں۔ ان حالات کے ماتحت آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ یہ حضرات سیاسیات حاضرہ میں کس طرح مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اب ہم اس سے آگے بڑھتے ہیں وَمَا توفیقی اِلّا باللہ العلی العظیم۔

باب دوم

ہندی متحدہ قومیّت اور قومیّت اسلام

جس طرح آزادی اپنی اثر اندازی۔ قوت تخلیق و تعمیر اور تسخیر کے لحاظ سے ہمہ گیر ہے۔ اسی طرح غلامی بھی اپنے تحرّل انگن کی دہرا شوبی و جہاں سوزی کے لحاظ سے لامحدود اور بیکرانہ ہے۔ جسمانی غلامی ایک

مصیبت ہے مگر ذہنی غلامی ایک عذاب ہے جو افراد اور قوموں پر ان کی بے عملی جمود، خودی سے بیگانگی اور اپنی منزل حقیقی سے دوری و بے خبری کی پاداش میں مسلط ہو جاتا ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جو یہود پر ان کی ناخدا ترسیوں، بے راہ رویوں، انبیا کی نافرمانیوں اور خطابات الٰہی کی جانب سے گراں گوشی کے باعث چھا گئی تھی۔ یہ نامرادی اور مردودیت کا وہ درجہ ہے۔ جس کو قرآن نے وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ کے الفاظ میں بیان کیا ہے، جذبات، حسیات، امیال و عواطف، تخیلات، تصورات، معتقدات، معیشت، معاشرت، چمنِ حیات کی کوئی کلی نہیں جو ذہنی غلامی کی جھلس دینے والی لُو سے مرجھا کر جل نہ جائے۔

ہندی مسلمانوں کی غلامی کا یہی پہلو ہے جو زیادہ گھناؤنا اور عبرتناک ہے۔ ظاہری بے بسی اور غلامانہ مجبوری کے لحاظ کا ثبوت دے چکے ہیں لیکن جن کی نگاہ مقام محمد عربی (فداہ روحی) پر ہے وہ جانتے ہیں، کہ مادر گیتی کے اس فرزند گرامی مرتبت سے وابستگی رکھنے والی اُمت کا صحیح مقام کیا ہے۔ اور اس مقام کی اہمیت کی جہت سے اس کی محکومی کیا چیز ہے۔ اور اپنے کھوئے مقام کو حاصل کرنے کے لیے اسکے خطوطِ عمل کیا ہونے چاہئیں۔ ہندو پانچ ہزار سال سے مختلف قوتوں کا اور سب سے بڑھ کر خود اپنے توہمات اور اپنی رسومات کا غلام چلا آتا ہے اسکی وجہ رسوم معاشرت و معیشت کا وہ مجموعہ ہے جسکو وہ مذہب کا نام دیتا چلا آیا ہے۔ بلند نصب العین ایک سچا الہامی مذہب ہی دے سکتا ہے اسکا مذہب جیسا کہ وہ اپنی موجودہ شکل میں ہے۔ ہندو کو یہ نعمت مرحمت کرنے سے قاصر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اُسکے قلب و نظر اس بلندی تک پہنچنے سے عاجز رہے جو وحیٔ نبوت کی پروردہ نگاہوں اور دلوں کے لیے مخصوص ہے۔ اسی تناسب سے اس کی آرزوؤں۔ امنگوں۔ تمناؤں اور ولولوں کی کائنات محدود اور پست تھی۔ اس کی نگہ اُمید و طلب اٹھی تو ایک طرف ہمالہ سے ٹکرا کر گر پڑی۔ دوسری جانب ساحلِ بحر پر جا کر رُک گئی۔ یہی ہندوستان کی چار دیواری اس کی دُنیا تھی جس کی وسعت میں اس کی جستجو گھوم پھر کر رہ گئی۔

مگر مسلمان کی کیفیت اس سے بالکل مختلف واقع ہوئی ہے۔ وہ اس پیغام کا امانتدار رہ

ہ سے ہندو اور مسلمان یکساں نظر آتے ہیں اور یہی وہ نظر فریب پردہ ہے جسے سیاسی چالوں پر ڈالنے میں برادرانِ وطن پوری مہارت

جو عالمگیر ہے اور جسکے لانے والے کا دعویٰ اپنے اندر عمومیت رکھتا ہے اِنِّی رَسُولُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ مسلمان کی تگ و دو کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے، جتنی کہ یہ کائنات۔ جس طرح اسکا رسول (علیہ التحیۃ والتسلیم) خیر البشر ہے۔ اسی طرح اس رسولؐ کی اُمت خیرُ الاُمم ہے! اس مقام رفیع کی توضیح یوں فرمائی گئی ہے۔ تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللّٰہ۔ یہ وہ ملت ہے جو اقوام و ملل عالم پر محتسب اور نگراں بنکر آئی ہے۔ جعلناکم اُمَّۃً وسطاً لتکونوا شھداء علی النَّاس۔ خلافت و نیابت ارضی روزازل سے اسی اُمت کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ اسلام زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے۔ انسانیت اور کائنات کی تکریم و تکمیل کے لیے جو مکمل ترین اور احسن ترین ضابطہ حیات ہو سکتا تھا وہ اسلام کی شکل میں دنیا کو مرحمت کر دیا گیا۔ دُنیا کی سیادت و قیادت اس قوم کا حق ہے جو اس پیغام کو ایک ہاتھ میں اور اپنے سر کو دوسرے ہاتھ میں لیکر نکلے۔ ان الارض یرثھا عبادی الصالحون ہ کا یہی مطلب ہے کائناتِ ارض کی وراثت اصلح بندوں کو اسلیے سونپی گئی ہے کہ رُوئے زمین سے قیصری۔ اسکندری۔ تاجداری۔ نمرودیت۔ اور فرعونیت کا وجود مٹ جائے حکومت صرف وَاحد القھار کے لیئے رہ جائے۔ مختصر الفاظ میں یہ ہے وہ پاکیزہ نصب العین جو مسلمان کی بعثت اور وجود کا ذریعہ ہوا۔ یہی وہ منزل ہے جو مسلمان کی راہ حیات متعین کرتی ہے۔ یہی وہ اختصاص ہے جو اسکو گورے، کالے، بندہ و آقا مشرقی و مغربی بلند و پست کے لغو و بے حقیقت نسلی۔ اور جغرافیائی امتیازات سے اٹھا کر اس مقام بلند تک پہنچا دیتا ہے۔ جس تک اُمتِ وسطہ کے علاوہ کوئی اور پہنچا ہے نہ پہنچے گا۔ شرف و اختصاص کا یہی دائرہ ہے جس میں مخصوص اسلامی قومیت ڈھلتی بنتی۔ تعمیر ہوتی۔ اور نشو و نما پا کر اپنے کمال کو پہونچتی ہے اسکے علاوہ مسلمان کی اور کوئی قومیت نہیں۔ نسلی۔ وطنی۔ تمدنی۔ لسانی ہر قسم کی قومیتیں اسلامی قومیت کے سامنے ہیچ اور بے حقیقت ہیں۔ نہیں بلکہ وہ بُت ہیں جنکے توڑ دینے میں ملتِ حنیفت کی نجات اور ارجمندی ہے، مسلمان قطب شمالی میں ہو یا جنوبی میں، مشرق میں ہو یا مغرب میں، انگلستان میں ہو یا ہندوستان میں، حجاز میں ہو یا ترکستان میں بلالحاظ زمان و مکان اس کی منزلِ مقصود قیام خلافت الٰہی

فی الارض اور اس کی قومیت اسلامی قومیت ہی رہتی ہے جو آلودۂ غبار نسل و وطن ہو کر اپنی اصلیت نہیں کھو بیٹھتی۔ مسلمان صرف مسلمان ہے اور کچھ نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وطن کے مفاد کے لیے ہر ممکن سعی عمل میں لانا۔ غاصبوں اور ظالموں کو دور رکھنا اپنی جگہ پر ضروری ہے، مگر جہاں وطنی عصبیت اپنی جائز حدود سے نکل کر قتل و غارتگری۔ سلب و نہب۔ ہوس ملک گیری اور اس سے متجاوز ہو کر امپیریلزم کی صورت اختیار کرے تو لعنت بنجاتی ہے۔ اور اسکو مٹا دینا۔ ختم کر دینا ہی انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اسلامی قومیت کی تعمیر جسکا خمیر اعلاء کلمۃ اللہ کا عشق ہے اپنے اندر اس ایوان باطل کی تخریب کا پیام رکھتی ہے۔ جیسا کہ چند سطور پیشتر عرض ہوا مسلمان اپنے پیام اور اسکی اہمیت کے لحاظ سے تمام اقوام عالم میں منتخب اور اخص امت ہیں۔ اسی لیے ہندو اور مسلمان کی فطرت کو آپس میں اتنا ہی بعد ہے، جتنا زمین کو آسمان سے، مشرق کو مغرب سے، ہندو مشرک ہے مسلمان موحد۔ ہندو دہم ہوکر ور خود تراشیدہ پتھروں کو خدا سمجھ کر اپنی بندگی کو ان کی نذر کرتا ہے۔ مسلمان رب العلمین اور فاطر السموٰت والارض کو مخاطب کر کے ایاک نعبد و ایاک نستعین کہتا ہے اسلیے یہ کہنا غالباً کسی تعصب یا تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کہ مسلمان فطرۃً آزاد اور ہندو فطرۃً غلام ہے۔

اس باب کی تمہید میں عرض کیا گیا تھا کہ ہمارے اکابر و زعماء سیاسی گفتگو میں دونوں کی غلامی و محکومی کو یکساں قرار دیتے ہیں، مگر ہم علیٰ وجہ البصیرت عرض کرتے ہیں کہ پتھر کی مورتیوں۔ گنگا جمنا کی لہروں۔ اور پیپل کی ٹہنیوں اور پتوں کی غلام قوم کا کسی دوسری قوم کا محکوم ہو جانا اس قوم کی نزدیک کوئی ایسی مصیبت نہیں جتنا عبرتناک اس قوم کا تخت و تسلط کی زنجیروں میں جکڑا جانا ہے۔ جسکے سر پر تاج خلافت و امامت رکھا گیا ہو، اور خدا کے علاوہ ساری کائنات جس کے سامنے جھکنے کے لیے بنائی گئی ہو، اسلیے مسلمان کی غلامی ایک قیامت خیز ہولناک و عبرت انگیز مصیبت ہے اور مصیبت سے بڑھ کر معصیت۔

مگر برا ہو صدیوں کی غلامی کا کہ اس نے مسلمان کے قلب و نظر سے وہ نور بھی چھین لیا جس میں

اس کو اپنا جمال اور اپنی منزل کا نشان صاف اور روشن نظر آیا کرتا تھا۔ مسلمان ہر جگہ اور خصوصاً ہندوستان میں "فشار بقدر منزلت" کے اُصول پر سطوت و عظمت کے اعلیٰ علیین سے گرا اور بغیر کسی درمیانی درجے میں ٹھیرے اسفل السافلین میں جا پہنچا، چونکہ اپنی سرفرازی و سربلندی کے زریں زمانہ میں اپنے دینی و ملی فرائض مہمہ سے بے خبر رہا اسلئے اکثر و بیشتر عیش و عشرت ہی کو وہ اپنی زندگی کا منتہائے کمال سمجھا کیا۔ اسی نشے میں وہ اپنی بلندی سے لڑھکا لیکن نشہ شدید قسم کا تھا باوجو پستی میں گرنے اور چور چور ہونے کے وہ نہ سمجھ سکا کہ اسکے ساتھ کیا ہوا۔ شاذ و نادر افراد و جماعات کو چھوڑ، حقیقی اور اجتماعی طور پر پوری ملت نے محسوس نہ کیا کہ آسمان نے کیا رنگ بدلا! اس غفلت کوشی اور عملی جمود و تعطل کے زمانہ میں حکمراں قوم نے اور خصوصاً ہمسایہ غلام قوم نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ بے سمجھ لیڈروں اور بے مغز ملاؤں کی باہمی چپقلش اور خود غرضیوں نے اس گرتی ہوئی اُمت کو اور بھی نیچے کی طرف دھکا دیا! سلطنتِ مغلیہ کا زوال ہندو کے لیے جرأت آفریں ہوگیا۔ چنانچہ اس نے فرنگی سیلاب کو اپنے لیے تائیدِ غیبی سمجھ کر اپنی نشاۃ جدیدہ کے لیے ہمہ گیر جدوجہد شروع کردی۔ اور اس شان سے کہ مسلمان کے آنکھیں ملکر اٹھ بیٹھنے سے پہلے ہی تجارت۔ سیاست۔ تعلیم و تنظیم اور دیگر شاہ راہوں پر قابض ہو گیا اس حد تک کہ اس میں مسلمان اور دیگر کمزور اقلیتوں کو مغلوب کرکے ان پر حکومت کرنے یا ان کو جذب کرلینے کی اُمنگ اور آرزو بے پناہ چٹکیاں لینے لگ گئی۔ مسلمان بھی زمانہ کی پیہم ٹھوکروں سے بیدار ہوا لیکن جب اس نے سعی و عمل کی وادی میں قدم رکھنے کا ارادہ کیا تو ہمسایہ قوم منزلوں آگے نکل چکی تھی یہاں تک کہ اس کی گردِ راہ تک کا سراغ نہ مل سکا۔ جنگ بلقان اور الغائے خلافت نے مسلمانوں میں ہلچل کے آثار پیدا کیے اور بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیر اُمّت کا یہ طبقہ دیکھتے دیکھتے سب کو پیچھے چھوڑ جائے گا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! وہی گریۂ سحری رہا۔ وہی آہِ نیم شبی رہی!! مسلمان کی بے تکی جدوجہد۔ بے نتیجہ دَوڑ دھوپ اور بے سود ایثار نے اس کی نفسیاتی کیفیت میں مرعوبیت کا جذبہ پیدا کردیا۔ ہندو یہ سب کچھ دیکھتا اور قوت پکڑتا رہا۔ حتیٰ کہ ہندوستان کو مسلمان ملیکشوں سے پاک کرنے اور پراچین تہذیب کو زندہ کرنے کا ارادہ اور بھی مضبوط

ہوگیا۔ شدھی سنگھٹن اور ہندی کی ترویج اسی پوشیدہ آرزو کے مختلف مظاہر تھے۔

انگریزی حکومت کے آغاز۔ دوران اور عروج اور اسکے ہندو مسلمانوں پر مختلف اثرات ونتائج پر جامع و مانع بحث زیرِ ترتیب مقالہ کے مقصودِ اصلی سے دُور جا پڑتی ہے۔ اِس دُکھ بھری کہانی کو مختصر کرنے کیلئے یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ انگریزی غلامی نے مسلمان کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ختم کر دیا! اور ہندو کو بحیثیت ہندو قوم زندہ کر دیا۔ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات ہندوستان کے سیاسی عروج میں خطِ امتیاز ر Land MARK کی حیثیت رکھتی ہیں! ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے جو اختیار و قوت مسلمان سے چھین کر انگریز کے حوالے کر دی تھی اس کا ایک اہم اور مؤثر حصّہ ہندو کو مل گیا۔ اور ہندوؤں کو سات صوبوں میں ہندو راج کا جلوہ مقصود نظر آنے لگا جسکے لیے بادیہ پیمائی اکبر کے دور سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ ٹھیک وہی حربے جو ساحرینِ فرنگ نے مسلمانوں کو سُلانے کے لیے اختیار کیے تھے، ہندو نے بھی استعمال کرنا شروع کر دیے ان میں سے ایک ہندی "متحدہ قومیت" بھی ہے۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت دورِ حاضر کی سیاسیات کا سب سے بڑا فریب ہے۔ متحدہ قومیت کیا ہے؟ اس کا جامع و مانع جواب جناب رازی نے اپنے بصیرت افروز پمفلٹ "متحدہ قومیت[1] اور مولانا حسین احمد" میں دیدیا ہے۔ اسکے بعد مزید قلم کاری بے سود معلوم ہوتی ہے۔ صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ ہندوؤں نے اپنے عزائم مشؤمہ کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کو یہ جُل دینے کی کوشش کی کہ ہندوستان ایک مُلک ہے۔ اسکے باشندے ایک قوم ہیں۔ اور اُن کی جماعت۔ یعنی کانگرس مُلک کی واحد نمائندہ جماعت ہے جو ہندوستان کو غیر مُلکی ظلم و ستم سے نجات دلا کر اسکے فرزندوں کی آزادی اور فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہے، اور "منزلِ ملّی" اسوقت تک نظر نہیں آسکتی جب تک

---

[1] شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام دہلی

لسانی۔ تمدنی۔ مذہبی اور دیگر قومی امتیازات قائم ہیں۔ لہٰذا انکو یکسر معدوم کر کے ہندوستانی قومیت کی تعمیر کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ بھولا بھالا مسلمان انگریزوں کے شاگردانِ رشید کے بچھائے ہوئے ہمرنگ زمین دام میں دانہ کی تلاش کرنے لگا۔ اُسکے ذہن میں "متحدہ قومیت" کے علمبرداروں کا ایک ایک اشلوک بیٹھنے لگا تا آنکہ بڑے بڑے اکابر۔ علمائے دین اور فہمیدہ لوگوں کا ایک طبقہ اس سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ گیا اور یہی وہ سب سے بڑی مصیبت ہے جو مسلمان پر عذاب الٰہی کی صورت میں مستولی نظر آرہی ہے! ظلمنا انفسنا ان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین ٥

ہم اوپر جو کچھ عرض کر آئے ہیں غالباً اس میں ایک شوشہ بھی ایسا نہ ہو جس سے مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر علمائے کرام کے احماق قلب کو اختلاف ہو لیکن یہ مسلمانوں کی شومی قسمت ہے کہ انہوں نے بتانِ وطن کے جادو سے مسحور ہو کر اس متحدہ قومیت کا پرچار شروع کر رکھا ہے جس کے اجزائے ترکیبی گائے کے تقدس۔ گنگا جمنا کے احترام۔ بندے ماترم کے ترانے۔ مہاتما جی کی پرستش اور ان اعضا پر مشتمل ہیں جن سے مغربی نیشنلزم اور اشتراکیت میں ڈھلی ہوئی پراچین تہذیب کی مورتی بنتی ہے! جس طرح گذشتہ باب میں ہم نے اپنی معروضات کی تائید میں مولانا کے ارشادات پیش کئے تھے یہاں بھی ان کی تحریریں قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔ اور فیصلہ خود ان پر چھوڑتے کہ مسلمان کا علاج متحدہ قومیت ہے یا اسلامی قومیت!

الہلال مورخہ ۹ راکتوبر ۱۹۱۲ء صـ۶ پر مولانا تحریر فرماتے ہیں

"ہمارے نزدیک اسلام کے دامن تقدیس پر اس سے بڑھکر اور کوئی بدنما دھبہ نہیں ہو سکتا کہ انسانیت حریت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں .... ہمارا عقیدہ ہے کہ جس طرح اسلام کا خدا اپنی ذات و صفات میں وحدہٗ لاشریک ہے بالکل اسی طرح اس کے لانے والے رسولؐ کمال انسانیت و تعبد اور قوائے نبوت و اصلاح میں بھی وحدہٗ لاشریک تھا۔ اور ان کی صفات و خصائص میں کوئی ان کا شریک نہیں ہے

رہ نسبت طلبی بیں کہ چہ شایاں رفتم !

پس ضروری ہے کہ جو اُمت اس خدائے واحد اور اس رسول واحد کے دامنِ تعلیم سے وابستہ ہے وہ بھی اپنے اندر اس شانِ وحدت یکتائی کا جلوہ رکھے وہ بھی اپنے اعمالِ زندگی کی ہر شاخ میں وحدہٗ لاشریک ہو۔ .... ’’جس قوم کو اس صدائے الٰہی سے مخاطب بنایا ہو اس کے لئے اس سے بڑھکر اور کیا بدبختی ہوسکتی ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی کی ہر شاخ میں دوسروں کے لئے نمونہ بننے کی بجائے خود غیروں کو مبتدائے اعمال بنا رہی ہو۔ .... ‘‘اللہ اللہ خدا تو مسلمانوں سے چاہتا ہے کہ مجھکو نمونہ بناؤ۔ اور میری صفات کاملہ سے مشابہت پیدا کرو۔ اور آج مسلمان ہیں کہ انسانوں کو اپنا اسوۂ حسنہ بناتے ہیں اور اگر کوئی نقالی بن آتی ہے تو انا الکافر بحج کا نعرہ لگا کر اس قدر نازاں ہوتے ہیں کہ حسین ابن المنصور کو انا الحق پر بھی اتنا ناز نہ ہوا ہوگا !‘‘

مولانا صاحب ! آپ کا ہر ارشاد لعل و گہر ہیں تولنے کے قابل اور سر آنکھوں پر رکھنے کے لائق ہے ’’دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے‘‘ یہ آپ کے دل کی آواز ہے مگر وہ دل جس سے یہ صدائے ایمان پرور نکلا کرتی تھی۔ کس ’’بت کافر‘‘ کی نذر ہوگیا ؟ ساری ملت آپ کے طور خطابت و تکلم اور سیناسے فراست و بصیرت پر دہیم ارنی ارنی کی صدائیں لگا رہی ہے لیکن آپ ہیں کہ چپ ہیں اور آپ کی طرف سے سابرمتی آشرم کی اینٹ اینٹ جوابا لن ترانی لن ترانی کے نعرے بلند کر رہی ہے ! کجا یہ کہ مسلمان کو خدائے وحدہٗ لاشریک قرآن واحد اور رسول وحدہٗ لاشریک کا دامن تھام کر زندگی کے ہر شعبہ میں وحدہٗ لاشریک بنا دینے کی دھن اور کجا یہ کہ خدائے واحد، رسول واحد اور قرآن واحد سے مایوس ہو کر مشرکوں کے بے تاج بادشاہ گاندھی کی زندگی کو آپ اپنا اسوۂ حسنہ قرار دے چکے ہیں۔ اور مسلمانوں کو اسی طرف کھینچنے کے لئے مضطرب ہیں ! ؎

خیابانِ خودی را دادہ آب

ازاں دریا کہ طوفانے ندارد !

اور دیکھیے :-

۲۳ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں فرماتے ہیں :-

"حالت یہ ہے کہ خود ہمارے نئے لیڈروں نے دین و دنیا کے اندر تفرقہ کی ایسی خلیج حائل کر دی ہے جو روز بروز دونوں کناروں کو دُور کر رہی ہے اور ان کو کسی طرح ملنے نہیں دیتی"...... "مذہب سے یہ الحاد آمیز بیگانگی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ آج اگر کوئی صدائے قرآنی بلند کی جاتی ہے تو ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتا ہے کہ یہ کیسی آواز ہے؟ .... بہت سے اس خیال پر متعجب ہیں کہ مسلمانوں کی پولیٹکل تعلیم بھی قرآن پر مبنی ہو (رأیت المنافقین یصدون عنک صدودا) بہتوں کو یہ کہنے سے نفرت اور غصہ کا بخار چڑھ آتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے جو کچھ ہے قرآن ہی میں ہے!!! اور قرآن ہی سے (قل موتوا بغیظکم) اور بہت سے ہیں جو فرعون کے جادوگروں کی طرح خوف زدہ ہو رہے ہیں کہ مذہب کا عصائے موسوی ثعبان مبین بنکر ان کو نگل نہ جائے۔"

حضرت مولانا! اپنی اس پرانی تحریر کو پڑھیے اور پھر فرمایئے کہ آج اسکا ایک ایک لفظ آپکا شکوہ سنج نہیں! آپ نے جس متحدہ قومیت کو بروئے کار لانے کی ٹھانی ہے، اس میں "دین" کا کہیں نام و نشان بھی ہے اور اگر ہے بھی تو اپنے ترجمان القرآن کا صفحہ ۵۰ کھولیے اور ومن یبتغ غیر الاسلام کی نیشنلسٹ تفسیر دیکھ کر ارشاد کیجیے کہ یہ دین وہی ہو گا جس کی منزل لیظھرہ علی الدین کلہ ہے یا کوئی اور دین؟ کیا دین کے ساتھ یہ سلوک کرنے کے یہ معنی نہیں کہ دین بازیچۂ سیاست ہے؟ اگر یہی معنی ہیں تو کیا دین کے آغوش سے پوری دنیوی زندگی کو کھینچ کر متحدہ قومیت کے تجویز کردہ ضابطۂ حیات کی تحویل میں دیدینے سے دین اور دنیا میں وہ تفرقہ پیدا نہیں ہوتی جس پر پل باندھنے میں دورِ قومیت پرستی سے پیشتر آپنے دن رات ایک کر دیئے تھے؟ اگر نہیں تو کیا متحدہ ہندوستان کی حکومت جس کے آپ اپنی مساعی کو منتج دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ ایسی حکومت ہو گی جس میں مسلمان کے دین اور دنیا ساتھ ساتھ چل سکینگے؟ اس قسم کی قومی حکومت تو خیر ہنوز دلّی دُور است کے مصداق ہے۔ کیا آپ کے سامنے کانگرسی صوبے نہیں جن میں مسلمانوں پر خواب و خور بھی حرام ہو رہا تھا۔ کیا یہ حقائق ایسے

نہیں جو آپ کے سامنے ہیں؟

دین اور دنیا کی تفریق کو مولانا مذہب سے الحاد آمیز بیگانگی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، بالکل بجا اور درست۔ لیکن حضرتِ محترم! مذہب سے الحاد آمیز بیگانگی کا علاج یہی ہے کہ آپ ملّت کی صفوں کو منتشر کرکے مشرک اور ملحد کانگرسیوں میں شامل ہیں۔ اور روزمرّہ کانگرس کے پنڈالوں میں آپ کے سامنے ایسی تجویزیں پاس ہوتی رہتی ہیں جو الحاد پرور اور مذہب سوز ہوتی ہیں۔ اپنے سینے میں مذہب کا درد رکھتے ہوئے آپنے "ملک کی نمائندہ جماعت" سے کیا کیا کرا ڈالا۔ کتنے دارالعلوم، کتنے مکتب، کتنی مسجدیں آپ کی کانگرس نے ایسی تعمیر کر ڈالی ہیں جن میں "مذہب سے الحاد آمیز بیگانگی" کا علاج ہو رہا ہے۔ بلکہ کیا حقیقت اسکے بالکل برعکس نہیں؟ کیا کانگرس نے آپ اور آپکے رفقائے کار کے ذریعے مسجدوں کے محراب و منبر کو خرید کر رائیت المنافقین ویصدون عنک صدودًا کا سماں نہیں پیدا کر دیا؟ اور نیشنلسٹ علماء کرام کی موجودہ روش کے طفیل مذہب سے الحاد آمیز بیگانگی اس حد تک نہیں بڑھ گئی کہ جب اتحاد بین المسلمین اور مرکزِ ملت کی صدائے قرآنی بلند کی جاتی ہے تو آپ میں سے ہر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتا ہے کہ یہ کیسی آواز ہے، اور بہت سے متعجب ہونے لگے ہیں کہ مسلمانوں کی پولیٹیکل رہنمائی بھی قرآن ہی کردے۔ قرآنی سیاست کے اتباع کی توفیق تو شاید نیشنلسٹ گروہ کو مشکل ہی سے ملے کیا آپ کے ڈاکٹر کنور محمد اشرف صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین کے جلسہ میں اس بات پر نعل در آتش نہیں ہوگئے تھے کہ طلبا یونین کے اندر بھی اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہیں! اور پھر کیا آپ ہر زعمائے کانگریس کی زبان سے یہ ارشاد نہیں سُنتے کہ مذہب خدا اور بندے کا ذاتی معاملہ ہے، اسے سیاست سے کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ نے آجتک ان اعلانات میں سے کسی ایک کے خلاف ایک لفظ تک بھی زبان سے نکالا ہے؟ ھاتو برھانکم ان کنتم صادقین ۰

انقلاب فرانس کا مقابلہ طلوعِ اسلام سے کرتے ہوئے حضرت مولانا اپنے مشہور مقالہ

الحرّیت فی الاسلام کے صفحہ ۵۰ پر فرماتے ہیں:۔

"اسلام صرف وطن کی محبت لیکر نہیں آیا۔ اسکے پاس تمام عالم کے عشق کا پیغام ہے اس نے جو کچھ کیا تمام عالم کے لیے کیا اور صرف وہی تھا جو یہ کر سکا وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۳۴ : ۲۳) اسلام کا خدا رب العلمین ہے جس کی ربوبیت عامہ میں کوئی خصوصیت مقام و وطن نہیں پس اس کا پیغام امن و نجات بھی رحمۃ للعلمین ہو کر آیا۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" (۲۲ : ۱۰۷)

مولانا کا یہ ارشاد کہ "اسلام صرف وطن کی محبت لیکر نہیں آیا" اس قابل ہے کہ آلہ مکبر الصوت مولانا کے گوش خود فراموش میں نصب کر کے اس زور سے اور اتنی بار دہرایا جائے کہ مولانا کی زبان قرآن ترجمان سے آج پھر یہی صدائے قرآنی بلند ہونے لگے۔ اور امّت احمد مرسلؐ کو مقامی کر دینے کی جو حکمت عملی مولانا کو پسند آگئی ہے۔ مولانا اُس سے ظلمت نفسی فاغفرلی مغفرۃً من عندک انک انت الغفور الرحیم کہہ کر توبہ کرلیں۔ لیکن آہ! علم و تقدس کے پندار کی موجِ قیامت خیز اور انانیت کے جذب محشر انگیز کے سامنے ان شکووں کا بند کیا سودمند ہو گا۔

آیئے اپنی حیرت زدہ نگاہوں سے اس خزاں دیدہ چمنستان کی کچھ اور سیر کیجئے۔

"حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطری ترقی اور قدرتی حقوق کے قیام کے لیے نسب و خاندان کے امتیاز باطل سے بڑھ کر اور کوئی روک نہیں ہوسکتی۔ .... اسلام نے ان اکرمکم عند اللہ اتقکم اور لیس للانسان الا ما سعیٰ کے قانون عام کا اعلان کرکے اسی مہلک انسانیت روگ کو مٹانا چاہا ہے۔ اور قرآن نے بتلایا کہ دُنیا کی تمام قدیم صداقتیں اسی طرف دعوت دیتی رہی ہیں صحف ابراہیم و موسیٰ میں یہی تھا .... لیکن افسوس کہ غرور نسل و وطن کے بُت کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پھر جوڑ لیے گئے اور نئے نئے بھیسوں میں پھر اس کی پرستش شروع ہوگئی اب بہت کم سر ملینگے جو اس فتنۂ باطل سے سرگراں نہ ہوں الا ما شاء اللہ (تذکرہ صفحات نمبر ۶۰)

"ارباب صدق و صفا ہمیشہ قید وطن و دیار سے آزاد رہے ہیں خدا کی ساری خدائی اُن کا وطن اور ساری زمین انکا گھرانا ہے"۔ تذکرہ صـ ۱۵

مولانا کا ارشاد ہے اور بالکل بجا کہ یہ ازلی اور ابدی حقیقت ہے۔ دنیا کی تمام قدیم صداقتیں اسی طرف دعوت دیتی رہی ہیں صحفِ ابراہیم و موسیٰ میں یہی تھا لیکن حضرت مولانا! ہندوستان کی "جدید صداقت" متحدہ قومیت کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ کیا آپ نے قوم کو اسطرف بلانے کا ٹھیکہ نہیں اُٹھالیا کیا ہندوستانی وطنیت کے رنگ میں آپنے دوسرے بتانِ آذری کے ساتھ ملکر غرورِ نسل و وطن کے ٹوٹے ہوئے بتوں کے ٹکڑے جوڑ کر بھارت ماتا کے مندر میں "صنم وطن" کی پرستش شروع نہیں کرادی؟

اور آپ کے قدیم ارشاد کے مطابق اربابِ صدق و صفا ہمیشہ قید وطن و دیار سے آزاد ہی رہے ہیں تو کیا آپنے اپنے دامن صدق و صفا کو "ہندی نیشنلزم" سے ملوث نہیں فرما لیا! ذرا اپنے ضمیر سے پوچھ دیکھیے! اندر سے کیا آواز آتی ہے!! ؎

آشوب بلاخیز ہے سیلِ وطنیت!
تنکے کی طرح بہہ گئے اُمّت کے مشاہیر

متحدہ قومیت کے باب میں حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد مدظلہ کے ملفوظاتِ ذیل قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا خود بدل جائیں اُنکا ضمیر دگرگوں ہوجائے۔ اُن کی زمین اُنکا آسمان اور ہوجائے، مگر ان الفاظ میں جو حقیقت مستور ہے، اٹل ہے، ابدی ہے اگر اسلام سچا ہے اگر اسلام خدائے حی و قیوم کا مُرتب کردہ جادۂ حیات ہے، تو یقیناً بڑی سے بڑی ریاکاری، بڑی سے بڑی ذہنی اور قلبی خرابی اس پر پردہ نہیں ڈال سکتی۔ ہم آج پھر مولانا کو اور مسلمانوں کو ان الفاظ پر غور کرنے اور انکو اپنے اعماقِ قلب میں جگہ دینے کی دعوت دیتے ہیں:-

"تم مسلم ہو اور مسلم دنیا میں اسلیے آیا ہے کہ عالم کو ہر طرح کے ظلم و فساد اور عدوان و طغیان سے نجات دلائے پس جس طرح کفار و مشرکین نے اپنے اعمال سیۂ اور مقاصد شنیعہ سے دُنیا کو بھر دیا ہے اسی طرح تم بھی اسے عدل و صداقت سے بھر دو۔ ہاں! اے فرزندانِ ابراہیم!! اٹھو اور ان ہیکلوں کو جنہیں سنگ سر کے انسانی بُت سکتے ہیں توڑ ڈالو اور صنم آبادِ عالم کے "صنم کبیر" وطن، کو جس کو تمہارے باپ ابراہیم نے اسلیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنے بندوں کو "معبودانِ صغار" کی تباہی کا افسانہ سنا سکے سب سے پہلے توڑ دو

تاکہ دنیا ان کی تباہی کا افسانہ بھی نہ سنا سکے! قوت و ضعف کا سوال نہ کرو کہ تم پچاس سے کمزور تر ہو اور نہ وہ تم ڈو سے قوی تر۔ (الحریت فی الاسلام ص۸۰)

باب سوم
اصلاح و تنظیم ملت کا طریق

گزشتہ اوراق میں قارئین کرام کی توجہ گرامی اس پیش پا افتادہ حقیقت کی طرف مبذول کرائی جا چکی ہے، کہ آج اسلام ہندوستان میں ایک نہایت ہی نازک دور سے گزر رہا ہے تمہید میں اشارۃً عرض کیا جا چکا ہے کہ مطلع ملت پر جب کبھی نکبت و ادبار کا خونین غبار چھایا اسکو پھیلانے اور طوفان بنانے میں ہمارے علمائے سو کا مقدس ہاتھ سب سے زیادہ دخیل رہا ہے پھر اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کہ یہ گروہ آنکھوں والے اندھوں اور کانوں والے بہروں پر مشتمل ہے حضرت مولانا صاحب آزاد قبلہ کی ان شہرۂ آفاق تحریروں کے اقتباسات پیش کر دیے گئے جو آج سے ربع صدی قبل حضرت ممدوح نے موجودہ مسائل پر ہندوستان میں آگ کی طرح پھیلا دی تھیں۔ آج جو مسئلہ ہمارے اور ان کے درمیان مابہ النزاع ہے مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی اور معاشی تنظیم کا سوال ہے، مولانا کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی ملی ہستی کے بقا کے لیے ہر کوشش ٹوڈیت اور رجعت پسندی ہے، مولانا صاحب اپنے سیاسی دیوتاؤں کی سفارش پر مسلمانوں کے ساتھ اتنی اور صرف اتنی فراخ دلی برت سکتے ہیں کہ وہ اپنی مسجدوں۔ خانقاہوں، مکتبوں، اور یتیم خانوں کے انتظام کے لیے کوئی "انجمن امداد المسلمین" بنا لیں لیکن سیاسی اور اقتصادی مسائل میں زنار کے پھانک سے رہائی کی ہر کوشش کفر ہے! ہم عرض کرتے ہیں کہ اسلامی زندگی ایک کل ہے اس کل کے اجزاء غیر منفک ہیں۔ ناقابل تقسیم ہیں۔ اس کے معاشرتی اور اقتصادی پہلوؤں کو مذہب سے علیحدہ تصور ہی میں نہیں لایا جا سکتا۔ یہ وہ حقائق ہیں جنکی سچائی پر مولانا کا گذشتہ مسلک اور زندگی کا لمحہ لمحہ شاہد ہے مولانا صاحب مسلمانوں کو ٹھیک اسی راہ پر چلنے کی ہدایت فرما رہے ہیں جو کعبہ کی بجائے ترکستان سومنات کو جاتی ہے۔ مسلمان کی علیحدہ تنظیم جرم! علیحدہ تعلیم گناہ! الغرضیکہ وہ تمام لوازمات و شعائر جس سے قومیت

اسلام تعبیر ہوتی ہی، مولانا کے نزدیک ٹھکرا دینے کے قابل ہوگئے ہیں، جو کیفیت آج مولانا اور اُنکے رُفقاء میں ولیاء پر طاری ہے ٹھیک یہی ہی جو انگریزی قوت واقتدار کے آغاز کے وقت انگریز پرستوں پر بھوت بنکر سوار تھی۔ خدا کی شان ملاحظہ ہو کہ وہ جذبہ مرعوبیت (Inferiority Complex) جنے پہلے پوری پوری ملت کو انگریزوں کی گود میں بٹھا دینے کی ٹھان لی تھی۔ آج انگریزی کاسہ لیسوں اور لاہ گردوں کے سینوں کو چھوڑ کر اُن حریت مآبوں کے دلوں میں گھر کر رہا ہے جو انگریزی سامراج کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ اور جنھوں نے مسلمانوں کو وہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا تھا جنے کبھی مسلمان کے سر پر تاج ہفت اقلیم رکھا تھا +

یہ گروہ آج ٹھیک وہی یا اُن سے ملتے جلتے دلائل پیش کر رہا ہے جو مسلمانوں کو نذر فرنگ کرنیوالا طبقہ اپنی روش کے جواز میں لایا کرتا تھا۔ وہ سب کچھ بھی مسلمان کی ہمدردی اور کتاب و سنت کے نام پر تھا اور یہ سب کچھ بھی اسی آڑ میں ہو رہا ہے +

اس وحشتناک ظلمت میں ہم وہی چراغ جلانا چاہتے ہیں جس کو طبقہ علما اپنے زعم باطل میں کسی پُر اسرار اشارے پر گل کر چکا ہے، ہم آج پھر مسلمانوں کے سامنے وہی پیغام دُہرانا چاہتے ہیں جس کا مخاطب وہ ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وقت آگیا ہے کہ ناکارہ قیادت، بوسیدہ سیادت اور اپنے باطل کی پرستار امامت کا نخچیر نیم کشتہ مسلمان حرم کے ان بتوں کو پاش پاش کر ڈالے اور اپنے سامنے وہی نمونہ رکھے جس کو کتاب اللہ نے "اُسوہ حسنہ" فرمایا ہے ؎

کتاب حکمت مغرب کی دل کشی پہ نہ جا

نظر میں نور الستؔ پیدا کر!"

مسلمان اُس پیغام کا حامل ہے جو خالق ارض و سماوات کا آخری پیغام ہے مسلمان اُس دین کا سرمایہ دار ہے جس کی تعریف میں الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا ؕ آچکا ہے۔ جب تک اسلام کی بعثت کا مقصد وہی ہے جو اسلام کے داعی نے بتایا ہے، جب تک مسلمان کا وظیفہ حیات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے جب تک اسلام کا مقصد اولیں

داخترین خلافۃ اللہ فی الارض کا قیام ہے مسلمان کے لیے وہی ضابطۂ حیات رہے گا جو اسکے اللہ نے تجویز فرمایا ہے، بنابریں حالاتِ حاضرہ کے مطابق تفقہ اور تدبّر فی الامور کی راہ سے تجدید ہوسکتی ہے مگر تاسیس کی قطعاً گنجائش نہیں، جو اسکے خلاف اعتقاد رکھتا ہے وہ اسلام کی روح اسلام کی سب سے بڑی حقیقت ختمِ نبوت کا منکر ہے مسلمان کے نزدیک دنیا و دین دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں اس کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، عبادت معاملت، تجارت معاشرت معیشت اور سیاست سب کچھ ایک ہی مقصد کے لیے ہیں۔ اور وہ مقصد مقدس اعلائے کلمۃ الحق ہے اور یہ مقصد اسوقت تک حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک اس منزل کو جانیوالی راہ صاف نہیں اور یہ راہ اسوقت تک صاف نہیں ہوسکتی۔ جب تک مسلمان قرآن کی روشنی میں ہر شعبۂ حیات پر حاوی نہیں ہوجاتا۔ بالفاظ مختصر جب تک اسکے جذبات، حسیات، تخیلات و تصورات اور حرکات و سکنات کا سرچشمہ مقام نبوت نہ ہو، دانستہ یا نادانستہ علمائے کرام کا وطن پرست طبقہ اس حقیقت کو فراموش کرنیکا مرتکب ہو رہا ہے اور بعض اوقات اس کا احساس تک اسمیں پیدا نہیں ہوتا، اس مرض کا علاج اُسی دعوت کی تجدید ہے جو حضرت مولانا ابوالکلام صاحب قبلہ نے اپنے دورِ نیشنلزم سے پیشتر قوم کو مندرجہ ذیل الفاظ میں دی تھی۔

"اس اصل الاصول کو کسی حال میں بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ دعوت و قیام حق اور اصلاح و تربیت اُمت کا اصل سرچشمہ و مرکز مقام نبوت ہے اور ہر عہد اور دور میں اس کا جس قدر بھی ظہور ہوتا ہے وہ سب اسی مقام سے متعلق و متصل اور سب کی روشنی اسی شمسی نظام و قوام عالم سے مکتسب و مستنیر اور تمام انہار فیضان و سعادت کے لیے یہی سلسبیل نبوت مخرج و منبع کا حکم رکھتی ہے۔ عیناً یشرب بھا عباد اللہ یفجرونھا تفجیراً ۰ اور کوئی قائم حق و داعی اصلاح و کاشف حقائق فوز و نصرت نہیں پا سکتا جب تک اس کا قدم منہاج نبوت پر واقع نہ ہوا ہو۔ ....

تاسیس و تشبہ بالانبیاء میں جس داعی حق کا قدم جس حد تک پہونچا ہے اُس حد و مقام کے مطابق کم و بیش ثمرات و برکات ظاہر و باطن حاصل ہوتے ہیں" صلہ ۱ تذکرہ

چند سطور چھوڑ کر پھر فرماتے ہیں:۔

جب دعوت و اصلاحِ اُمت کا سرچشمہ و اصل مقامِ نبوت ٹھیرا اور تمام عوازم اُمورِ دعوت اِس سے ماخوذ اور اس کے اسوہ سے متاسّس ہیں تو ضرور ہے کہ عالمِ تجدید و احیائے شریعت کے بھی تمام کاروبار اسی اسلوب و نہج پر واقع ہوں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اُصول و اساسات سے لے کر جزئیات و فرعیات اعمال تک ٹھیک ٹھیک اسی مقام کے حالات و منازل متشبہ و متخلق بل کا الظل و العکس ظہور میں آویں، اور من جملہ سُنن و لوازمِ اتباعات نبوت کے یہ ہے کہ دعوتِ انبیاء کے ظہور کے لیے حق و ذکرِ حق بالکل مفقود و معدوم ہو جانا ضروری نہیں۔ بلکہ اس قدر بس کرتا ہے کہ سخت درجہ کا اضمحلال اور پژمردگی کی حالت اس پر طاری ہو جائے اور داعیانِ حق کی جماعت نہایت قلیل اور مغلوب ہو جائے بجز چند نادر و منتشر افراد کے سوا ان کی کوئی ہستی و جمعیت باقی نہ رہے۔ برخلاف اس کے داعیانِ فسادات کا دَور دَورہ ہو۔ اور وہ جو ایک چیز ہے یعنی صرف حق کا وجود ہی نہیں، بلکہ حق کا قیام و ظہور و نفوذ اور مجرد امرِ دعوت ہی نہیں۔ بلکہ دعوت کا نظام و قوام اور محض دعوت افراد و جماعت ہی نہیں بلکہ دعوتِ ملت تو اسکا کارخانہ بالکل درہم برہم ہو جائے بلکہ نام و نشان تک باقی نہ رہے، وکاَنْ لَّم یکن شیئاً مذکوراً یہی غربت و اقلیتِ حق ہے، جو بسبب کمالِ ضعف و بیچارگی و عدمِ حصولِ نتائجِ مطلوبہ معدوم کا حکم رکھتی ہو تو ظہر الفساد فی البر و البحر سے تعبیر کی جاتی ہے الیضاً ص ۱۰۵ ۱۰۴

اسی طرح مسلمانوں کے رستے سے پتھر ہٹا دینا بھی ایمان کی شاخ اور عمل حق ہے مگر تمام اُمت کی راہ سے سنگِ بطلان و فساد کو دُور کر دینا بھی عمل ایمان و اقدام حق ہے ....

...... لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دعوتِ حق کی صدائیں تو اٹھتی ہیں مگر اُس جاذبیتِ معنویہ سے محروم ہوتی ہیں اور اس لیے مجذوب القلب لعالم نہیں ہو سکتیں یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ دعوتِ حق کی صدائیں تو اٹھتی ہیں مگر بمصداق خلطوا عملاً صالحاً و آخر سیئاً۔ داعیانِ حق کا جو گروہ موجود ہوتا ہے ان کی دعوت ٹھیک ٹھیک نہج قویم اور تقیم پر نہیں ہوتی یعنی منہاجِ نبوت کے علوم و اعمال کو ان میں غلبہ و احاطہ حاصل نہیں ہوتا یا کتاب و سُنت کی دعوتِ خالص و آمیزش کی حقیقت سے خالی ہوتی ہے۔ ....

....

مگر ساتھ ہی اس اعتبار سے کہ طرح طرح کی غلطیوں اور لغزشوں یا آمیزش ظلمت رائے و قیاس غیر صالح یا کوری بدعات یا محدثات سے پاک صاف نہیں ہیں۔ اپنا حکم دائر کھو دیتی ہیں اور برکات نصرت و فوز حاصل نہیں کر سکتیں ص۱۲۰، ۱۲۱ تذکرہ

پس حقیقت وہی ہے جس کو وحی الٰہی اور حاملین منصب نبوت علی الخصوص آخرہم و اعظمہم محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب اتباع نے دنیا کے آگے پیش کیا۔ اور شک و ظن کی ظلمت و مجوبیت کی جگہ علوم سماویہ اور نبویہ کی یقینیات و براہین کا دروازہ نوع انسانی پر کھول دیا اور جیسے علم و عمل کا نمونہ سلف و صالح و اوائل امت مرحومہ من السابقین الاولین من المہاجرین والانصار والذین اتبعوہم باحسان من ورثۃ الانبیاء و الخلفاء الرسل و ائمۃ الہدیٰ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ نے اخلاف و آخرات کو ہمیشہ کے لیے دکھلا دیا۔ اولئک علی ھدی من ربھم و اولئک ھم المفلحون ص۱۵۵ ایضاً

مولانا صاحب قبلہ کا یہ بصیرت افروز اقتباس کسی تشریح اور حاشیہ آرائی کا محتاج نہیں اگر مولانا کی جلالت قدر اور مرتبت گرامی اجازت دے تو عرض کیا جائے کہ جب اسلام کی یہ سب سے بڑی حقیقت آپ پر منکشف ہے اور کبھی آپ ہی نے یہ پیام کہن تازہ کیا تھا تو آج اس سرچشمہ فیض و نور کی جانب آپ کی نگاہیں کیوں نہیں اٹھتیں آج آپکا قبلۂ قلب و نگاہ یثرب کی بجائے واردھا اور آنند بھون کیوں ہے؟ یہ کیا قیامت ہے کہ کل تک تو آپ سرچشمۂ نبوت سے فیضیاب ہونے والوں کو اولئک ہم المفلحون سمجھ کر انکے زمرہ میں شامل ہونے کو ذریعہ نجات و سعادت اور موجب فخر و مباہات سمجھتے تھے اور آج رخالکم بدھن،یہی مرتبہ گاندھی کو عطا ہو رہا ہے سہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپکا حسن کرشمہ ساز کرے!

پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

"آیات کریمہ سے فضیلت و سیادت حضرت ختم المرسلین کا یوں اثبات ہوا کہ امت مسلمہ کو ساری امتوں سے بہتر فرمایا، اور شریعت محمدیہ کو تکمیل ادیان اور اتمام نعمت قرار دیا! اور ظاہر ہے کہ مطیع کی افضلیت مستلزم افضلیت مطاع اور نعمت کا اتمام نعم سابقہ سے اعلیٰ و اتم ہونا حامل و مبلغ نعمت کے

اعلیٰ وافضل ہونے پر دال ہے۔" (ایضاً ص ۳۷۱)

یہ خدا پرست ابوالکلام کی خدا پرستی کی آواز ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت ختم المرسلین کی ختم المرسلینی نے مسلمانوں کو جہاں پہنچا دیا ہے، وہاں ساری بلندیاں ہیچ ہیں اور سارے امتیازات لاشی محض ہیں لیکن بدبختی ملاحظہ ہو کہ حیوۃ اللہ کا حلقہ بگوش مسلمان آج اپنی حریت گاندھی کے چرنوں میں دیکھتا ہے اور جس دین کو آج تک ایک نعمت اور اتمام نعمت سمجھتا رہا اسکی بنیادی حقیقت دنیا کے دیگر مذاہب کی بنیادی حقیقتوں کے مساوی قرار دیکر اس کو تمام فوقیت اور برتری سے محروم کر دیتا ہے ؎

برہمن از بتاں طاقِ خود آراست

تو قرآں را سرِ طاقِ نہادی!

یہ ابتدا ہی میں واضح کیا جا چکا ہے کہ جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے خالصتاً لوجہ اللہ ہے۔ کسی ذاتی پرخاش کی بنا پر نہیں۔ ہر مسلمان جسکے سینے میں دل اور دل میں محمد (فداہ ابی و امی) کی محبت کی ایک چنگاری بھی موجود ہے اور ملت کو سربلند اور فائز المرام دیکھنے کا آرزومند ہے ہمارے نیشنلسٹ علمائے کرام کی موجودہ روش پر خون کے آنسو بہائے گا۔ آج مسلمانوں کو ہندوستان میں جن حالات و واقعات کا سامنا ہو رہا ہے۔ ٹھیک اسی قسم کے حالات اس سے پیشتر ہوتا رہا ہے اور ہر طوفانِ حوادث میں جس ہاتھ نے مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی کو پار لگایا وہی ہاتھ آج بھی ساحل نجات پر پہنچائے گا۔ یہی حقیقت ہے جس کو علمائے کرام کی روش چھپا رہی ہے غصہ ہے تو اسی چیز پر۔ زیادہ دکھ اسلئے بھی ہوتا ہے کہ یہ حقائق خود ہمارے علمائے کرام جانتے اور پیش فرماتے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد قبلہ الہلال مورخہ ۹ اکتوبر صفحہ ۵ پر "شاہراہ مقصود" کے عنوان سے رقمطراز ہیں۔

"بارہا گفتہ ام و بارِ دگر می گویم!"

"مسلمانوں کے لئے تمام عالم میں صرف ایک ہی ہاتھ ہے جو رہنمائی کر سکتا ہے اور ایک ہی چشم نگراں ہے جو لغزشوں سے بچا سکتی ہے یہ وہی ہے جو کبھی سینا پر تجلی بن کر چکی۔ کبھی فاران پر ابرِ رحمت بنکر

نمودار ہوئی کبھی غارِ ثور میں لاتحزن إنّ اللہ معنا کی صدا میں تھی کبھی بدر کے کنارے إن ینصرکم اللہ فلا غالب لکم کے پیام میں تھی کبھی اُحد کے دامن میں وکان حقاً علینا نصر المؤمنین کی بشارت تھی اور آج بھی ایک مٹے ہوئے کارواں، ایک برباد شدہ قافلے، ایک برہم شدہ انجمن کے لیے امید کا آخری سہارا ہے، اور زندگی کی آخری روشنی ہے۔"

جس رباب جاں نواز سے یہ نغمۂ سرمدی بلند ہوا تھا اسکا تار تار ہنوز لرزاں ہے، مگر وائے محرومی کہ کسی ساحرِ سحر فن نے زخمہ ور کا ہاتھ کھینچ لیا!! ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اسی تحریر میں دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"ہماری پالیسی کی بنیاد کوئی وقتی یا فوری واقعہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ وہ ایک مستقل اور دائمی اعتقاد ہونا چاہئیے جو اپنے قیام کے لیے کسی بیرونی سہارے کا محتاج نہ ہو۔"

حضرت مولانا ہی اپنی بصیرت کی روشنی میں ارشاد فرمائیں کہ "ہندی قومیت" اور "اسلامی قومیت" دونوں میں سے کون سی چیز وقتی ہے۔ اور کون سی دائمی؟ اور دونوں میں سے کون سی چیز ہے جو کسی بیرونی سہارے کی محتاج نہیں ؎

زقرآں پیشِ خود آئینہ آویز!
دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز!! (اقبالؔ)

حضرت مولانا آزاد قبلہ نے جمعیۃ العلماء کے اجلاس لاہور کی صدارت فرماتے ہوئے جن الفاظ میں علمائے کرام کو خطاب فرمایا تھا آج انہی الفاظ کو ہم دہراتے ہیں: اور "متحدہ قومیت" کے علمبردار مولانا حسین احمد صاحب مدنی، فرنگی ہیٹ اور نیکر کے عاشق مولانا عبید اللہ سندھی اور گاندھی کی مہاتمائیت کی گشتہ جمعیۃ العلماء کو دعوت دیتے ہیں کہ ان الفاظ کے حقائق پر غور فرمائیں اور اس آئینہ میں اپنی روش کو دیکھیں، اور بتائیں کہ وہ کہاں تک اُنکے منصب کو زیب دیتی ہے:۔

"حضرات علمائے کرام! وارکان جمعیت اسوقت ایک بہت بڑی آزمائش ہمارے طریق عمل کے لیئے درپیش ہے۔ ہم نے مُدتوں کی غفلت کے بعد قومی، واجتماعی اعمال کی کش مکش وکشاکش میں قدم رکھا ہے اسلیئے سب سے پہلے ہماری نظر آج کل کے مجلسی واجتماعی کاموں کے طرق واسلوب پر پڑتی ہے اور تقلید ومحاکات کا جذبہ ہمیں بے اختیار اُن کی جانب کھینچے لگتا ہے لیکن میں آپ کو یاد دلاؤنگا کہ آپکی راہ ان راہوں سے بالکل الگ ہے اور کتاب اللہ کی ہدایت اور حکمت نبوت کی سنت نے آپ کو دُنیا اور دُنیا والوں کے گھڑے ہوئے طریقوں وقاعدوں سے مستغنی کر دیا ہے، آپ اسلیئے نہیں ہیں، کہ انسان کے بنے ہوئے طریقوں کی تقلید کریں۔ بلکہ آپ کو علم وعمل شریعت اس لیئے دیا گیا ہے تاکہ دُنیا کی آنکھیں آپ کی طرف اُمید وطلب سے اُٹھیں اور آپ کی ہدایت اُنکے لیئے اتباع وتقلید کا پیام ہو۔ آپکے پاس اللہ کی کتاب اور اُسکے رسول کی سُنت ہے، اور ان دو چیزوں سے بڑھ کر اور کون سا مبدءِ علم اور سرچشمہ حکمت ہوسکتا ہے، جو انسانی اعمال کے تمام اُصول وفروع کے لیئے دُنیا میں وجود رکھتا ہو؟ دنیا میں علم ویقین صرف وحی الٰہی اور علوم واعمال نبوت ہیں۔ اس کے سوا علم ویقین کا اس سماء ودنیا کے نیچے وجود نہیں۔ اسکے ماسوا جس قدر بھی قرآن پکار کر کہہ رہا ہے ظن ہے تخمین ہے۔ قیاس ہے، اٹکل ہے۔ لُعب ہے۔ ریب ہے ظلمت ہے۔ بعضھا فوق بعض۔ (خطبۂ صدارت اجلاس لاہور صفحہ ۹۸)"

پھر صفحہ ۵۴ کے ذیل کے ارشادات دیکھئے اور غور فرمایئے کہ جس زبان اور دل سے یہ الفاظ نکل سکتے ہیں اگر وہی کسی "اور" کے ترجمان ہو جائیں تو کوئی کیا کریگا۔ اسلیئے مولانا سے کچھ عرض کرنا بے سود سی بات ہے

کوئی کیونکر بتائے کیا بتائے!
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

"فی الحقیقت احکام شرع کی رُو سے مسلمانانِ ہندوستان کے لیئے دو ہی راستے ہیں۔ اور اب بھی دو ہی راہیں ہیں، یا تو ہجرت کر جائیں، یا نظام جماعت قائم کر کے ادائے فرض ملت میں کوشاں ہوں۔"

مولانا کے سامنے انہی کی تحریرات کو پیش کرنا اور اُنکے تفقہ فی الدین کا واسطہ دیدے کر خود اپنے اوپر اور مسلمان قوم پر رحم کی درخواست کرنا. دیوار سے سر پھوڑنے کے مصداق ہے مگر مسلمانوں کو جو موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا ہیں، اور مختلف قوتوں کی کشاکش کے طوفان میں سراسیمہ حیران ہیں غور کرنا چاہیئے کہ جس اسلامی تنظیم اور جماعت بندی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ایک نئی اور گمراہ کن راہ پر چلنے کی ان کو دعوت دی جارہی ہے، خود علمائے "وطن پرست" کی نگہ میں بھی باطل ہے، اس ایمانی تحکم اور یقین کو ملاحظہ فرمایئے جسنے مندرجہ صدر زندہ جاوید کلمات مولانا کی زبان سے نکلوائے تاکہ رہتی دُنیا تک یادگار رہیں اور آنے والوں کی عبرت کا سامان بہم پہنچائیں۔ جب خدا کا لطف و کرم کنارہ کش ہو جائے تو باوجود اپنے علم و فضل اور معرفت حقائق کے انسان کتنی بڑی گمراہی میں مبتلا ہوکر خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہو جاتا ہے۔

اب آخری سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ان مصائب کا حل کیا ہے! اسکا جواب بھی مولانا کی زبان سے سُنیئے:-

"میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ اس راہ کی کامیابی یہ ہے کہ ہمارا عمل خالصًا لوجہ اللہ ہو اور نیز طریق صواب پر ہو، اور طریق صواب نہیں. مگر طریق سنت و منہاج نبوت ....

.... آج ہمارے قومی کاموں کی ہر شاخ میں بنیادی غلطی یہی ہے کہ ہم نے اصولی طور پر طریق عمل کا فیصلہ نہیں کیا۔ مسلمانوں کی اصلاح کے لیئے ضروری طریق تجدید کی ہے یا تاسیس کی؟ یعنی اس کی ضرورت ہے کہ از سر نو نئی باتیں، نئے طریقے، نئے ڈھنگ۔ نئے نظام اور نئی نئی چالیں اختیار کی جائیں یا صورت حال یہ ہے کہ پہلے سے ایک کارخانۂ ملت موجود ہے جس کو اپنے بقا و ترقی کے لیئے کسی نئی بات کی احتیاج موجود نہیں. حضرات! دین کامل ہو چکا ہے، اور اتمام نعمت کا اعلان کر دیا گیا الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔ پس یہ اصل تو متفق و مسلم ہے کہ راہ اصلاح صرف تجدید کی ہے تاسیس کی نہیں۔ خود شارع علیہ السلام نے

بھی ہمیں تجدید ہی کی خبر دی نہ کہ تاسیس کی؟!

مولانا صاحب قبلہ! جب دین مکمل ہو چکا اور آپ اس پر اپنے اعتقاد کا اعلان بھی فرما رہے ہیں تو ازراہ انصاف فرمائیے کہ آپ کا مسلک قومیت متحدہ اور روش سیاسی جسکے اتباع کی دعوت آج تمام مسلمانوں کو دے رہے ہیں، اسلام ہی کی تجدید ہے یا کسی اور دین کی؟ اجتماعیت اور مرکزیت ہی وہ قالب ہے جس میں رُوح اسلام زندہ رہ سکتی ہے۔ یہی وہ طریق بقائے ملت ہے جو داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتلایا۔ لیکن آپ کا مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کی مخالفت کرنا بتا رہا ہے کہ آپ کے نزدیک وقت کی ضرورت تجدید نہیں تاسیس ہے اگر یہی واقعہ ہے اور اسکی سچائی پر ایمان لوجہ اللہ ہے تو از راہ ملت نوازی اپنی اولیں فرصت میں "نیشنلزم" سے پیشتر اس موضوع پر آپنے جو کچھ لکھا ہے اس سے برات کا اظہار فرمائیے اور ان تحریرات سے دست برداری کا قطعی اعلان فرما دیجیے جو ہزاروں صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں اور جن سے آج بھی ملک کا ذرہ ذرہ تپش گیر ہے۔ اگر آپ یہ کر سکیں تو ملت آپ کی انتہائی ممنون ہوگی۔ اسلیئے کہ آپ کے گزشتہ ارشادات کی وجہ سے مسلمان آج تک آپ کے تقدس اور تفقہ فی الدین کے جادو میں گرفتار ہے اور باوجود آپ کی بدلی ہوئی روش کے حقیقت کو حقیقت کے رنگ میں دیکھنا ہوا جھجکتا ہے۔ اسکے بعد مسلمانوں کے لیئے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں رہے گا کہ آپ کے نزدیک اصلاح امت کا طریق تجدید نہیں، بلکہ اسی نہج کی تاسیس ہے جسنے کبھی اکبر کے دین الٰہی کی شکل اختیار کی تھی و آج متحدہ قومیت کے قالب میں نمودار ہوئی ہے جس میں الشیٔ بالشیٔ اور ولکم فی القصاص حیاۃ کی حقیقت اہنسا میں بدلجاتی ہے!۔

جمعیۃ العلماء کے قیام کے مقاصد کے ذکر کے بعد طریق تجدید کی تائید کے دوران میں اصلاح کی بنیاد دین کے مبادیات پر رکھتے ہیں:۔

"اسلام کے نظم شریعت میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں۔ اسلام نے شریعت الٰہی کو نوع انسانی کی تمام سعادت و ہدایت کا کفیل و سرچشمہ قرار دیا ہے اور مسلمانوں کی سیاسی و علمی۔ اخلاقی و قومی۔ مدنی زندگی کی بنیاد صرف ایک ہی حقیقت جامعہ پر ہے۔ یعنی شریعت اسلامیہ اور کتاب و سنت۔

مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔ شریعت نے انہیں تلایا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی قوم وہی ہیں۔ وہی خیر الامم ہیں۔ وہی خیر البریۃ ہیں وہی شہداء علی الناس ہیں۔ وہی خلیفۃ اللہ فی الارض ہیں۔ ان کے عروج و سعادت کی علت صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور سنت رسول کو انھوں نے دستور العمل حیات قرار دیا تھا۔ قرآن کی نسبت صاحب قرآن کا اعلان تھا:۔ ان اللہ یرفع بھذا الکتاب ویضع بہ آخرین۔" (رواہ مسلم، خطبہ صدارت جلد محمد صفحہ ۲۵، ۲۶)

اجتماعیت اور مرکزیت اسلامی کے متعلق مولانا کا ارشاد ہے:۔

"قرآن حکیم ظہور شریعت و نزول وحی کا پہلا نتیجہ یہ قرار دیتا ہے کہ اجتماع اور ائتلاف پیدا ہو اور بار بار کہتا ہے کہ تفرقہ و انتشار شریعت و وحی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اور اس لیے یہ نتیجہ شریعت سے بغاوت و عدول اور اس کو بالکل ترک کر دینے کا ہے"۔ (مسئلہ خلافت طبع دوم صفحہ ۱)

سلسلہ تحریر جاری رکھتے ہوئے صفحہ ۱۳ پر لکھتے ہیں:۔

"اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر کھینچی گئی ہے ...."

حضرت مولانا! یہ حقیقت آج کس مسلمان پر واضح نہیں۔ علمائے کرام کی بڑی سے بڑی گمراہی اس پر پردہ نہیں ڈال سکتی لیکن ایک اور حقیقت بھی جو آج مسلمانوں پر آشکارا ہو رہی ہے اور وہ یہ کہ وہی لوگ جو کبھی مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر کھینچا کرتے تھے آج اسکا حلیہ بگاڑ کر ہندو وطنیت کی ایک تصویر کھینچ کر اس کی پوجا میں مصروف ہیں۔ "ومن یضلل اللہ فلا ھادی لہ"۔ انگریزی خواں طبقہ اور عوام جن کی نظر حقائق دین و رموز شرع متین پر نہیں اگر بادیہ غوایت و ضلالت میں بھٹک جائیں تو چنداں تعجب انگیز نہیں، مگر اسکو مسلمانوں کی بدبختی کے علاوہ اور کیا کہیے علمائے دین بھی "بتان وطن" کی جادو نظری کا شکار ہو چکے ہیں ؎

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی!
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی! (اقبال)

اصلاح و تعمیر اُمّت کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :-

"تیسری چیز جماعت ہے تمام اُمّت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کر رہنا چاہیے الگ الگ نہیں رہنا چاہیے"

یہ اُس ابوالکلام کا بحیثیت "امام الہند" ارشاد ہے۔ جو آج خود مرکزِ ملّت کو تباہ کرنے میں مصروف ہیں۔

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے!

جماعت کی توضیح یوں فرمائی گئی ہے :-

"جماعت سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ جس میں اتحاد و ائتلاف، امتزاج اور نظم ہو۔ اتحاد سے مقصود یہ ہے کہ اپنے اعمالِ حیات میں افراد منتشر نہ ہوں ایک دوسرے سے ملے ہوں۔ اور اُن کے تمام اعمال مل جل کر انجام پائیں۔ کسی گوشۂ عمل میں بھی پھوٹ نہ ہو۔ ائتلاف کا مرتبہ اتحاد سے بلند تر ہے امتزاج ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے۔ اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت ہونی چاہیے۔ یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ ملکر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے، ویسا ہی مزاج اسکے ساتھ ملایا جائے یہ نہ ہو کہ دو ایسے آدمیوں کو ملا دیا گیا جن کی طبیعت و خصلت اور استعداد و صلاحیت باہم دگر میل نہیں کھا سکتی اس کو خواہ کتنا ہی ملاؤ لیکن تیل اور پانی کی طرح ہمیشہ الگ الگ ہی نظر آئینگے"

قوموں کے اتحاد، امتزاج اور ائتلاف کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ ہندو مسلمانوں کو آپس میں ملا کر ایک قومیت کی تعمیر کیا چیز ہے؟ کیا ان میں سے ایک تیل اور دوسرا پانی نہیں؟ کیا آپ نے دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی کسی کیمیاوی ترکیب سے تحلیل فرما کر دوسرے میں جذب ہونے کے قابل بنا دیا ہے! دُنیا دیکھ رہی ہے کہ آپ مسلمان کی ساری "ذہنیت" یعنی قومی اور اسلامی عصبیت کو ختم کر کے پانی بنا دینے اور اس پانی کے قطرہ قطرہ کو "ہندی وطنیت" کی گنگا میں ملا دینے کی سعی فرما رہے ہیں! اگر یہ حقیقت نہ ہوتی ہو تو آج

آپ کا مسلک وہی ہونا چاہئے جسکے ماتحت کبھی آپ فرمایا کرتے تھے :-

غور کرو ایک مشرک اور مسلم کی زندگی میں کتنا فرق ہے مشرک پتھروں سے ڈرتا ہے کہ وہ خدا ہیں ستاروں سے ڈرتا ہے کہ وہ خدا ہیں، کہنہ اور بوسیدہ قبروں کی اینٹوں سے ڈرتا ہے کہ وہ خدا ہیں، خود انسانوں سے ڈرتا ہے کہ وہ خدا ہیں لیکن ایک مسلم کا عقیدہ ہے کہ فاطر السموات والارض کی ایک ذات کے سوائے دُنیا میں کوئی وجود نہیں جس سے ڈرا جائے"

الحریت فی الاسلام صہ ۹۵

ہم مولانا سے بادب پوچھتے ہیں کہ ہندوستان میں جس کو متحد فرمانے کا عزم مولانا کی عزیز ترین متاع ہے کیا ۲۲ کروڑ مشرک نہیں بستے۔ کیا یہ پتھروں، ستاروں، سانپوں، پیپل اور بڑ کے درختوں کے پتے پتے کو خدا نہیں سمجھتے، کیا ان کی عبودیت گئو ماتا پر نثار نہیں؟ اگر آپکا بدلا ہوا مسلک اسکا جواب نفی میں دے تو کیا آپ ان سب کو فاطر السموات والارض کے آستانِ جلال و جبروت پر جھکا چکے ہیں اگر آپ کے نورانی ضمیر کا کوئی گوشہ اسکا جواب بھی نفی میں دے تو کیا آپ اس سے انکار کی جرأت فرمائینگے کہ مسلمان کی فطرت وہی ہے جس کی تعبیر آپ کے مندرجہ بالا اقتباس میں جھلک رہی ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر آپ کس برتے پر ہندو مسلمانوں کو ملکر سیاسی جدوجہد کی تلقین فرما رہے ہیں کیا مختلف منزلوں، مختلف دلوں، مختلف دماغوں اور مختلف فطرتوں کے باوجود یہ کسی نتیجہ پر منتج ہو سکتی ہے۔ کیا اس قسم کی رہنمائی قرینِ دانش و انصاف بھی ہے۔ اسکا نتیجہ ایک ہی ہو سکتا ہے کہ یا تو مسلمان شدھ ہو جائیں یا ہندو حلقہ بگوشِ اسلام۔ موخر الذکر شے کچھ دشوار نہ تھی۔ اگر ابو الکلام جیسی ہستیاں اپنے مرکزِ ثقل سے نہ ہٹتیں مگر ؎

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

آج مسلم لیگ کا سب سے بڑا جرم اُس کی یہ دعوت ہے کہ مسلمان بلا شرکتِ غیرے اپنی تنظیم کریں اور ایک خالصۃً اسلامی غیر مخلوط جماعت کے افراد کی حیثیت سے زندہ رہیں سنئے کہ مولانا صاحب ایسی تنظیم کے متعلق کبھی کیا فرماتے تھے۔ ارشاد تھا :-

"ایک بہت بڑی چیز جس کی ہم میں کمی ہے تنظیماتِ عمل (آرگنائزیشن) ہے اور اسکے لیے

اتنا ہی کافی ہے کہ ایک مقصدِ مشترک سامنے ہو اور سب میں اُسکے نام سے ایک رشتہ باہمی قائم ہو جائے" (الہلال، ۳۰ جولائی ۱۹۱۳ء)

یہی آرگنائزیشن جسے آج "فرقہ پرستی" (Communalism) قرار دیا جاتا ہے اور جو اس ضابطہ کی رُو سے، جو آسمان وار دھاسے نازل ہوتا ہے اور جو مولانا صاحب اور اُنکے رفقائے کار کے نزدیک وحیٔ منزل کی طرح واجب التسلیم ہے ناقابلِ عفو گناہ ہے، وہی تنظیم جسکے متعلق مولانا نے مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" میں کبھی تحریر فرمایا تھا:-

"اور اسی بنا پر شارعؑ نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیت" اور "حیاتِ جاہلیہ" سے تعبیر کیا ہے ..... قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شئ نہیں ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے اور فرد کا وجود اور اعمال بھی اس لیے ہیں تاکہ انکے اجتماع و تالیف سے ہیئتِ اجتماعیہ پیدا ہو .... اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں اور عہدِ صحابہ سے لے کر عہدِ تدوینِ کتب تک مختلف طبقات رواۃ و حفاظ میں اسقدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد شایدکوئی چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔ سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کرونگا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام بیان کیا گیا ہے .... یعنی فرمایا تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جنکے لیے اللہ نے مجھے حکم دیا ہے، جماعت۔ سمع۔ طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھی باہر ہوا تو اسنے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جسنے اسلام کی جماعتی زندگی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بُلایا تو اُسکا ٹھکانہ جہنم ہے لوگوں نے عرض کیا کہ (حضور) کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا خواہ وہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو فرمایا، ہاں اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور بزعمِ خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔"

اسکی تشریح میں مولانا صاحب فرماتے ہیں:-

پہلی چیز جماعت ہے۔ یعنی تمام اُمّت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہوکر اپنے مرکزِ قومی سے جُڑ کر رہنا چاہیئے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہیئے۔ آگے چلکر شہرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جنسے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہوکر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو۔ اور کسی امیر کے تابع نہ ہو۔ اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔"

اِن بیّن اور واضح تصریحات کے بعد ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ خود حضرت مولانا اور اُنکے ہم مشرب حضرات کی موجودہ زندگی کیسی ہے اور کس کی راہ ہے! یہ حضرات

آپ ہی اپنے ذرا طرزِ عمل کو دیکھیں؟

ہم اگر عرض کرینگے تو شکایت ہو گی!

اور سینئے فرماتے ہیں :-

"بس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا۔ اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور طاعتِ امام سے الگ ہوگیا۔ گویا وہ اسلام سے خارج ہوگیا۔ اسکی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو۔ اور روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو"

ہم سوائے اسکے اور کیا کرسکتے ہیں کہ ان حضرات کے حق میں دُعا کریں کہ اگر کسی لغزش سے اُنکا قدم اسلامی جادۂ مستقیم سے پھسل گیا ہے تو کم از کم ان کی موت تو جاہلیت کی موت نہ ہو۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

پھر ارشاد ہے :-

مسلمانوں کے لیئے راہِ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں جس میں وہ ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے اُنپر

بند ہوگئے ہیں، جماعتی زندگی کی معصیت سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک جماعت بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہوگیا ہے وہ بالکل اس گلہ کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔"

ایسی غیر اسلامی زندگی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے فرماتے ہیں:۔

قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے لیکن جماعتی معصیت کا تخم یعنی نظام جماعتی نہ ہونا ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔"

ہم مولانا صاحب سے دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ وہی "جماعتی معصیت" جو کبھی اُن کے نزدیک پوری قوم کی قوم کو تباہ کرنے کا موجب تھی۔ آج کس طرح قوم کے حق میں مسیحا نفس بنگئی؟ سوچئے اور غور کیجئے کہ آپکی موجودہ روش کس طرح آپکے دامنِ تقدیس و تفقہ کی دھجیاں بکھیر رہی ہے اور وہ بھی کسی دوسرے کے ہاتھ سے نہیں بلکہ خود آپ کے اپنے ہی دستِ مبارک سے۔

تحریکِ آزادی میں مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہونی چاہیئے، اسکے متعلق دورِ قومیت پرستی سے پیشتر کا اسلام مولانا صاحب کو کیا سکھاتا تھا ملاحظہ فرمایئے:۔

"ہم نہایت حسرت کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ جو لوگ تقسیم بنگال کی تنسیخ سے نہیں بلکہ مدت سے اپنے اندر آزادی اور حقوق طلبانہ پالیسی کا ولولہ رکھتے ہیں۔ گو عام راہِ ضلالت سے الگ رہنے کا انہیں الاؤنس دینا چاہیئے۔ لیکن افسوس ہے کہ اُنکے سامنے بھی ہندوؤں کی پولیٹکل جدوجہد کے سوا کوئی مستقل اور علیحدہ راہ نہیں ہے۔ وہ بھی اپنی ترقی کا سدرۃ المنتہیٰ صرف یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ہندوؤں کے قدم بقدم چلنا سیکھ جائیں، بیشک ہمارے عقیدہ میں بھی آجکل مسلمانوں کے لیے عبرت اور تنبیہ کا سب سے بڑا سبق ہندوؤں کے سیاسی اعمال میں ہے اور بڑی بدبختی یہی تھی کہ آج تک اس سے عبرت حاصل نہیں کی گئی۔ لیکن پیروانِ "امام مبین" کے لیئے اس سے بڑھ کر کوئی مذہبی موت نہیں ہو سکتی۔ کہ اعمال زندگی کے ایک ضروری شعبے میں ان کو اسلام تعلیم دینے سے مجبور و لاچار ہو گیا ہو، اور

اس کی طرف سے مایوس ہوکر انھیں ایک دوسری قوم کے دسترخوان کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں پر للچانا پڑے۔ اگر ایسا ہی ہے تو بہتر ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے دُنیا کو ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے، جو صرف خطبۂ نکاح میں چند آیتیں پڑھ دینے یا بسترِ نزع پر سورۂ یٰسین کو دُہرا دینے کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے ہمارے نزدیک اسلام کے دامنِ تقدیس پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بدنما دھبہ نہیں ہو سکتا کہ انسانی حرّیت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں ...... پس اگر مسلمان زندگی حاصل کر سکتے ہیں تو مسلمان بنکر ہندو یا مسیحی بنکر نہیں۔ اگر شمع کافوری جل رہی ہے تو آپ کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے اسکا ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت ہے، پھر یہ بھی فرض کر لیجئے۔ کل ہندوؤں کو اپنی پالیسی بدل دینی پڑی جتنی راہیں انسانی دماغ کی پیدا کردہ ہیں۔ اُن میں تغیر و تبدل ہر وقت ممکن ہے البتہ خدا کی تعلیم میں ممکن نہیں کہ لا تبدیل لکلمات اللہ پھر کیا اس حالت میں مسلمان بھی اپنے اماموں کے ساتھ اپنی نمازیں توڑ دینگے! ذرا غور سے کام لیجئے کہ گہری اور تفکر طلب باتیں ہیں ہم مسلمانوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں۔ کہ خواہ کسی اصول پر مبنی ہو۔ لیکن وہ ایک ایسی راہ پیدا کر لیں جو ان کی مستقل اور مخصوص راہ ہو جس میں کبھی تغیر کی ضرورت نہ ہو، تمام خارجی اثرات تغیر سے محفوظ ہو۔ نیز کہا جا سکے کہ وہ مسلمانوں کی راہ ہے۔ ... ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی رُوح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح اور قومیں بھی لیکن مسلمانوں کی تو کوئی علیحدہ قومیت نہیں جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین یا جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب یا بالفاظ مناسب تر انکا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دینگے۔ اسوقت تک ان میں نہ قومیت کی روح پیدا ہو سکے گی اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں جو تاثیر رکھتی ہے۔ مسلمانوں کے لیئے وہ اثر صرف "اسلام" یا خدا کے لفظ میں ہے یورپ میں "نیشن" کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن آپ کے پاس اُسکے مقابلہ میں کوئی لفظ ہے تو خدا یا "اسلام" ہے ..... (الہلال)

(۱) مسلمانوں کے لیئے ہر شئے اُنکے مذہب میں ہے، پس وہ اگر آج کل اپنی پولیٹیکل زندگی

اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اُس کی جگہ اس شئی ہی کو کیوں نہ پیدا کریں جو نہ صرف پالٹیکس بلکہ قومی اعمال کی ہر شاخ کو زندہ کردے۔

(۲) قرآن کریم صرف نماز اور وضو کے فرائض بتلانے کے لیے ہی نازل نہیں ہوا بلکہ وہ انسانوں کے لیے ایک کامل اور اکمل قانون فلاح ہے جس سے انسانی زندگی کی کوئی شئی باہر نہیں۔ پس مسلمانوں کی ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا۔ اُنکے لیے موجب فوز و فلاح نہیں ہوسکتا۔

(۳) ان کو اپنا نصب العین صرف "اسلام" بنانا چاہیئے اور ساری طاقت اس میں صرف کرنی چاہیئے۔ کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر صرف احکام اسلام کے مطیع و منقاد ہو جائیں۔ اسلام ہی ان کے لیے پالٹیکس کی راہ کھولے گا۔ تعلیم کا حکم دیگا۔ اخلاق و فضائل میں تبدیلی پیدا کردیگا اور وہ تمام باتیں جن کو ترقی یافتہ قوموں میں دیکھ کر وہ للچا رہے ہیں، نقصانوں اور مضرتوں سے صاف ہو کر ان میں پیدا ہو جائیں گی۔

(۴) تعلیم معاشرت اور سیاست میں ان کو بربنائے اتباع اقوام کوئی راہ اختیار نہیں کرنی چاہیئے بلکہ بربنائے مذہب"۔ (الہلال ۹ اکتوبر، ۲۳ اکتوبر و ۱۰ نومبر ۱۹۱۲ء)

کانگریس کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ مذہب انسان اور اسکے خدا کے درمیان ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اُسے سیاسیات سے کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے چنانچہ قارئین طلوع اسلام سے پوشیدہ نہیں کہ کانگریس کے ارباب حل و عقد آئے دن یہی کچھ کہتے رہتے ہیں، اور برملا کہتے ہیں۔ اور مولانا صاحب کا سکوت۔ اور عملاً اس جماعت میں شرکت اس امر کی دال ہے کہ آج وہ بھی یہی کچھ سمجھ رہے ہیں لیکن دیکھیے کہ مصلحت کوشیوں کے اس دور سے پیشتر مولانا صاحب کا اس باب میں کیا مسلک تھا۔ کسی صاحب نے انھیں لکھا کہ آپ مذہب اور سیاست کو آپس میں کیوں ملاتے ہیں۔ اسکے جواب میں آپ نے فرمایا:۔

"آپ فرماتے ہیں کہ پولٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیے لیکن اگر الگ کردیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے ہم نے تو اپنے پولٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ میں

مذہب کے پیدا کئے ہوئے ہیں ہم انھیں مذہب سے کیونکر الگ کردیں؟ ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو، ایک کفر صریح ہے اور پالیٹکس بھی اسی میں داخل ہے، افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اسکی اصل عظمت میں نہیں دیکھا "ما قدروا اللہ حق قدرہ" ورنہ اپنی پولٹیکل پالیسی کے لیے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کی اقتدا کرنے کی ضرورت پیش آتی۔......

"آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں پولٹیکل خیالات کے تین راستے موجود ہیں الہلال کس راہ پر قوم کو لیجانا چاہتا ہے۔...... الحمد للہ کہ ہم جناب کی قرار دی ہوئی تینوں انسانی راہوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، بلکہ اس چوتھی راہ الٰہی کی طرف دعوت دیتے ہیں جو قرآن کی بتلائی ہوئی راہ صراط مستقیم ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لیے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اسلیے مشرک ہے۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اسکے پیروؤں کو اپنی پولٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے، مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دُنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنیوالے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں، وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دُنیا اُنکے آگے کھڑی ہو جائے گی۔ انکا خود اپنا راستہ موجود ہے، راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں خدا ان کو سربلند کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اسکو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اسکی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے جھکیں۔

"یہ الہلال کی پالیسی ہے اور یہی دعوت ہے جس کی طرف ہم مسلمانوں کو بلانا چاہتے ہیں یہ کسی انسانی دماغ کی اختراع نہیں، اور نہ کسی انسانی گروہ کا اتباع و تقلید ہے اگر مسلم لیگ مسلمانوں کی پولٹیکل راہ نمائی کرنا چاہتی ہے تو اسکو یہی راہ اختیار کرنی چاہیے (مضامین آزاد حصہ دوم)

اسی سلسلہ میں حضرت مولانا دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں :۔

ہم تو خود سے مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انھوں نے اپنے سامنے دو ہی راستے دیکھے یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندوؤں اور کانگریس کی شرکت یعنی ہمیشہ آزادی سیاسی (؟) کو ہندوؤں کا مرادف سمجھا مگر خود اپنے تئیں بھولے رہے اور اسلئے بھولے رہے کہ خدا کو بھلا دیا ...... اسلئے ہماری تمام سعی وجہد کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو یاد دلادیں کہ دُنیا میں رہنے کے لیے جتنی چیزیں مطلوب ہیں وہ خود انکے پاس موجود ہیں اور دوں کے دروازوں کو دریوزہ گری کے لیے کیوں تک رہے ہیں"۔

(الہلال ۲۹ دسمبر ۱۹۱۲ء)

ہمارا خیال ہے کہ جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے نگۂ بصیرت عطا فرمائی ہے۔ انکے لیے اتنے اقتباسات ہی کافی ہیں۔ مولانا آزاد تو ہمارے نزدیک (خدا کرے کہ یہ قیاس غلط نکلے) "سواءٌ علیھم ءَانذرتھم ام لم تنذرھم" کی حد میں پہونچ چکے ہیں اس لیئے ان سے ہمیں کسی اصلاح کی اُمید نہیں۔ البتہ وہ فریب خوردہ حضرات جو آجتک یہ سمجھتے چلے آرہے ہیں کہ چونکہ شرکتِ کانگریس کے مسلک پر بڑے بڑے "علماء حضرات" بالخصوص مولانا ابوالکلام صاحب آزاد گامزن ہیں۔ اس لیئے حق وصداقت کی یہی راہ ہوگی۔ یہ سطور ان کی چشم اعتبار واکرنے کے لیئے کافی ہونگے۔ اور ہدایت تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے یضل بہ کثیرًا ویھدی بہ کثیرًا۔

خاتمہ کلام محترم قارئین! مقالہ کے آغاز میں اور جگہ جگہ یہ حقیقت ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں وطنیت اور اسلام کی آمیزش مسلمانوں کے لیئے "موت وحیات" کی کش مکش کے ہم معنی ہے، اس لحاظ سے اتنا نازک وقت اُمت کے سر پر کوئی نہیں آیا۔ اس آشوب میں سے کامیابی کے ساتھ اسوقت تک گزرنا ناممکن ہے جب تک مسلماں مسلمان بن کر دل ودماغ کے ساتھ مسائل حاضرہ کو محسوس کرنے اور سمجھنے کی سعی نہیں کرتا۔ اگر مسلمان اپنی ملی اور انفرادی ہستی سے دست بردار ہو جائیں تو آج سارا خروش ختم ہو سکتا ہے لیکن اسوقت مسلمان (خاکم بدہن) بحیثیت مسلمان فنا ہو جائیگا اور صرف بحیثیت ہندوستانی باقی رہ جائیگا۔ یاران وطن کی ساری جد وجہد یہی ہے

کہ مسلمان کا وجود بحیثیت مسلمان مٹ جائے اگر وہ باقی رہے تو ہندوستانی قومیت کا جزو بنکر باقی رہے، یہ ہندوستانی قومیت کیا ہوگی اس کی طرف بھی اشارہ کیا جاچکا ہے یہ ہندو دھرم کی نشاۃ جدید ہوگی. جو اسلام کے مزار پر تعمیر کی جائیگی، چونکہ برادرانِ وطن اس ملک میں غالب اکثریت کے مالک ہیں لہٰذا جمہوریت کے اصولوں پر انہی کی ہر چیز قومی کہلائے گی۔ مقدس خیال کی جائیگی۔ اور یکمل خود اختیاری وطنی حکومت اس کا احترام بنوکِ شمشیر کرائیگی۔ متحدہ قومیت کی بحث کے دوران میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا یہ محض واہمۂ خلاق ہی کی نادرہ کاریاں نہیں بلکہ حقائق ہیں جن کو ہر قلب زندہ محسوس کر رہا ہے، ہر چشم وا دیکھ رہی ہے اور ہر گوش شنوا سن رہا ہے الا ختم اللہ علےٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلےٰ ابصارھم غشاوۃ

اندریں حالات عزت و آبرو سے ہندوستان میں زندہ رہنے کے لیے مسلمانوں کو بڑی سے بڑی قربانی کے لیے ہر لمحہ تیار رہنا چاہیئے! ہر نئی طلوع ہونیوالی سحر اپنے دامن میں آزمائش کا پیام لاسکتی ہے! قبل اسکے یہ آزمائش کی گھڑی سر پر آجائے ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ:۔

(۱) اسلام خدا کا آخری۔ مکمل ترین اور عالمگیر پیام ہے۔ اسکو کسی لسانی۔ وطنی۔ نسلی یا معاشی مفاد کے تابع تسلیم کرلینے کے معنی اسکی صداقت سے انکار ہے۔

(۲) و لہٰذا اس پیغام کی حامل اُمت دنیا کے جس حصے میں ہو ایک عالمگیر برادری کا جزء ہے جسکو وطنی اور نسلی گروہوں میں تقسیم کرنا پوری کی پوری اُمت کی ہلاکت کے مصداق ہے۔

(۳) مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ اسوقت تک نہیں ہوسکتا۔ جب تک اسکے سر پر تاج خلافت و نیابت الٰہی دوبارہ نہیں جگمگاتا۔ اس لئے اس کا انتہائے مقصد روٹی کبھی نہیں ہوسکتا۔ مسلمان جب اپنے اندر خلیفۃ اللہ فی الارض ہونیکی صلاحیت پیدا کریگا تو ساری دنیا کیا لوح و قلم اسی کے ہونگے۔ روٹی تو ایک بے حقیقت اور ضمنی شے ہے جس کا مسئلہ خود بخود حل ہوجاتا ہے۔

(۴) اس مقام رفیع کے حصول کے لئے اولیں شرط تخلیق و تعمیر مرکز ہے۔ اسلام بنی نوع انسان کی برادری

اجتماعیت کا پیام ہے لا اسلام الا بالجماعۃ مسلمان جب تک ایک مرکز قومی سے جڑ کر نہیں رہتا اسلام کے دائرے سے دور ہے۔ لہذا مسلمان کی قومیت صرف اسلام ہے۔ اس کے علاوہ جتنی قومیتیں اسکے سامنے پیش کی جارہی ہیں اسکی تباہی و بربادی کے لئے ہمرنگ زمیں دام کی حیثیت ہی رکھتی ہیں۔

ان سیدھے سادے حقائق کے پیش نظر مسلمانوں کو خدا کا نام لے کر اپنی منتشر صفوں کی شیرازہ بندی کر کے بسرعت اپنی منزل کیطرف گامزن ہو جانا چاہیئے۔ ان کی ہدایت اور دستگیری کے لئے اللہ کا ہاتھ۔ اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت موجود ہے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ اس پر آشوب دور میں علمائے کرام کی یکجہتی و یکسوئی اور رہنمائی مسلمانوں کے لئے باعث برکت و رحمت ہوتی لیکن لا تقنطوا من رحمۃ اللہ اگر آپ صحیح معنوں میں مسلمان بن کر اسوۂ حسنہ کا عروۃ الوثقیٰ تھام کر میدان میں اتر ینگے تو کان حقا علینا نصر المؤمنین کا سماں خود بخود پیدا ہو جائیگا۔ جو علمائے گرامی مرتبت آپکے ساتھ ہیں اور کتاب و سنت کی روشنی میں آپ کی رہنمائی و اعانت فرما رہے ہیں وہی کافی ہیں۔ بڑی بڑی شخصیتوں کی طرف امید و طلب سے دیکھنا اور کچھ نہ کرنا آئینہ دار مایوسی ہے اور کفر کی طرف لے جانیوالی شے ہے۔ جو بڑی ہستیاں ملت سے کٹ کر اغیار سے مل چکی ہیں اُن کی بڑائی ختم ہو چکی ہے ؎

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اُن کے علم و فضل۔ زہد و تقدس اور عبا و قبا سے مرعوب ہونے اور بھٹک جانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ خود حضرت مولانا ابو الکلام صاحب قبلہ آزاد کے الفاظ ہیں۔

"سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائینگے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہ ہونگے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور اُدھر اُن کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال اِن سگانِ دنیا کا ہے ساری باتوں میں متفق ہو جا سکتے ہیں۔ لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو وہاں پہنچکر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ اِن کا سرمایہ نازعلم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع

سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے بلکہ یکسر علم جدل وخلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اسکی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز کرتی رہتی ہے۔ فساق وفجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جام تندرستی پیتے ہیں۔ اور چور اور ڈاکو مل جل کر راہ نمائی کرتے ہیں مگر یہ گروہ خدا کی مسجد[ص۱] اور زہد و عبادت کے صومعہ وخانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہوسکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا۔ پھاڑتا اور پنجہ مارتا رہتا ہے میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار والفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں مگر عین محراب کے نیچے پیشوائی اور امامت کے لئے اُن میں سے ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیح نے احبار یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے" ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو نہیں معلوم لیکن ہم نے مسجد کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔" تذکرہ صہ ۸۳، ۸۴

یہ اقتباس حضرت مولانا ابوالکلام صاحب قبلہ آزاد کی مشہور معروف کتاب تذکرہ سے ماخوذ ہے۔ اسکو پڑھکر ہر سادہ دل مسلمان جو علمائے کرام کے ہر فرمان واجب الاذعان کو الہام سمجھ کر عمل پیرا ہوتا ہے لرز جاتا ہے۔ اس پر کچھ مزید عرض کرنیکی نہ جرأت ہے نہ ضرورت، یہ حضرت مولانا کے منصب ہی کا حصہ تھا۔ جب حقیقت یہ ہے تو کیا آج بھی مسلمانوں کے لئے اللہ اور اسکا رسولؐ ہی کافی نہیں؟

الیس اللہ بکاف عبدہٗ

ص۱ بالکل درست۔

برہمن گفت۔ برخیز از در غیر — زیارانِ وطن ناید بجز خیر
بیک مسجد دو ملا می نگنجد — ز افسونِ بتاں گنجد بیک دیر

(اقبال)

نقد و نظر

تاریخ اسلام حصہ اوّل عہدِ رسالت و خلافت راشدہ مولفہ شاہ معین الدین احمد صاحب رفیق دار المصنفین۔ کتابت وطباعت وکاغذ عمدہ قیمت فی نسخہ ۲ روپے، منیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ سے مل سکتی ہے۔

دار المصنفین نے اسلامی سلطنتوں کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا ہے جسکا یہ پہلا حصہ ہے اس میں اختصار کے ساتھ عہدِ رسالت اور خلفاء راشدین کی تاریخ ہے، غالبًا یہ وہی چیزیں ہیں جو پہلے سیر الصحابہ میں شائع کی جاچکی ہیں اب بغرض تجارت نئے ڈھنگ سے شائع کی گئی ہیں۔ ان میں کوئی خاص بات ہم کو نظر نہ آئی۔ دار المصنفین کی قدامت پرستی معلوم ہے اسلیئے وہ کوئی نئی چیز دینے سے قاصر ہے اور غلط اور صحیح روایات میں تمیز کرنے کی تنقیدی قوت سے سراسر عاری۔ اور یہ باتیں اس کتاب میں جابجا نمایاں ہیں۔ مثلاً خلفاء بنی اُمیہ و بنی عباس کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ کبھی کبھی وہ اپنے دشمنوں کو مخفی تدبیروں سے قتل کرا دیا کرتے تھے اور اسکو اپنے بساطِ سیاست کی ایک اچھی چال سمجھتے تھے اسوجہ سے انکے حامیوں اور حاشیہ نشینوں نے ایسی روایتیں بنائیں کہ اس قسم کے قتل کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ثابت کر دیں۔ تاکہ ان سلاطین کو اپنی کارروائیوں کے جواز کی سند مل جائے اس کتاب میں یہ روایتیں درج ہیں صفحہ ۴۴ پر کعب بن اشرف کے متعلق لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ نے اسکے قتل کی خدمت محمد بن مسلمہ کے سپرد کی جنہوں نے اسکے گھر جاکر بلطائف الحیل اسکو قتل کر ڈالا"۔ پھر صفحہ ۴۵ میں سلام بن ابی الحقیق کی بابت لکھتے ہیں کہ آنحضرت ؐ کے ایما سے ایک انصاری عبداللہ نے خیبر میں جاکر اسکو قتل کر دیا۔

ان مکذوب اور مکروہ روایات کی بنا پر رحمۃ العالمین ؐ پر خفیہ قتل کرانے کا الزام وہی شخص رکھیگا جو تنقیدی عقل سے عاری اور راویوں کی دسیسہ کاری اور مقام نبوت سے قطعًا نا آشنا ہو۔

جب رسول اکرم صلعم کے متعلق اس کتاب کا رویہ یہ ہے تو صحابہ کا کیا ذکر۔ صفحہ ۳۲۹ میں ہے کہ

حضرت ابو موسیٰ اشعری نے حضرت عمرو بن العاص کو کتے سے مشابہت دی۔ اور حضرت عمرو بن العاص نے انکو گدھا بنایا۔ نعوذ باللہ منہا حالانکہ یہ وہ حضرات ہیں جو اُسوقت اُمتِ اسلامیہ کے برگزیدہ ترین افراد تھے اور سب سے اہم اسلامی معاملہ یعنی خلافت کے فیصلہ کے لیئے امیر معاویہ اور حضرت علی کی طرف سے حَکَم مانے گئے تھے۔ اگر انکے اخلاق کا حال یہ تھا تو اور لوگوں کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ مگر دار المصنفین کو اس سے کیا بحث ہے، اسکو تو روایت کتاب میں ملجانی چاہیئے اور بس۔ اگر جناب مؤلف ان جھگڑوں سے واقف ہوتے جو تحکیم کے معاملہ میں امتِ اسلامیہ کے فرقوں میں پیدا ہوئے تو ان کی سمجھ میں بات آسانی سے آجاتی کہ یہ کسی ایسے شخص کی گھڑی ہوئی ہے جو صحابہ کا دشمن تھا مؤلف کی ناواقفی کا تو یہ حال ہے کہ آغاز کتاب ہی میں صفحہ ۳ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی بیوی سارہ تھیں۔ اُن کے بطن سے اسماعیل پیدا ہوئے اور ہاجرہ کے شکم سے اسحاق۔ حضرت ہاجرہ نے گہوارۂ تمکنت میں پرورش پائی تھی اسلیئے وہ حضرت سارہ اور اسماعیل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھیں۔"

حالانکہ مسلمان بچے بھی جانتے ہیں کہ حضرت سارہ کے بیٹے اسحاق تھے اور ہاجرہ کے اسماعیل۔ اور یہ "گہوارۂ تمکنت" کیا شے ہے؟ کیا حضرت ابراہیم کوئی دنیادار رئیس یا بادشاہ تھے جو انکا گھر گہوارۂ تمکنت تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مہر تاریخ اور فقہ دونوں کی کتابوں میں چارسو درہم لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اس کتاب میں صفحہ ۳۰ میں ہے:۔

"آنحضرت نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ کا نکاح حضرت علی کے ساتھ ۴۸ قیمت کی زرہ پر کیا"

زبان جو اس کتاب میں استعمال کی گئی ہے تاریخ کے لیئے موزوں نہیں ہے، مولف نے شاعرانہ الفاظ بے محل استعمال کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے عبارت طفلانہ بلکہ لغو ہوگئی ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ صفحہ ۴۸ میں جنگ احد کے بیان میں لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرت مصعبؓ کی شہادت پر خبر اڑ گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے"۔

شاید وفات پانے سے مُراد یہ ہے کہ شہید ہوگئے۔ صفحہ ۴۹ میں ہے کہ:۔

"چھ برس تک مسلمانوں نے کعبہ کو غلط انداز نظر سے بھی دیکھا نہ تھا"

غالباً مطلب یہ ہے کہ حج یا عمرہ کیلئے مدینہ سے مکہ نہیں گئے تھے۔ ورنہ کعبہ مدینہ میں تو تھا نہیں کہ غلط یا صحیح نظر ڈالکر بھی اسکو دیکھ سکتے۔ اس لفظ کے استعمال کا اسقدر شوق ہے کہ صفحہ ۸۰ پر لکھتے ہیں کہ:۔

"صلح حدیبیہ کی بدولت ایک مرتبہ مسلمان یادگار ابراہیمی کو نگاہ غلط انداز سے دیکھ آئے تھے"

یہاں نگاہ غلط انداز بالکل بے معنی اور لغو ہے۔ صفحہ ۹۵ میں حضرت ابو سفیان کے اسلام لانے کے متعلق لکھتے ہیں:۔ "حضرت عباس کے ڈرانے سے کلمۂ توحید پڑھ لیا اور وہ سر پر غرور جو خدا کے سامنے بھی نہ جھکتا تھا آستان نبوی پر خم ہو گیا" معلوم نہیں کہ یہ ابو سفیان کی ہجو ہے یا مدح۔ لیکن زبان تو قطعاً تاریخ کی نہیں ہے۔ صفحہ ۷۴ میں ہے کہ:۔ "یہ سحر آفریں آیات سنکر"

آیاتِ قرآنی معجزہ ہیں نہ کہ سحر۔ مگر ایسے لوگوں کو کون سمجھائے۔ جو تاریخ میں خواہ مخواہ شاعری کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔ الغرض زبان کے اس بے تکے پن کی مثالیں اس کتاب میں تھوڑی نہیں ہیں۔

ہم کو دار المصنفین سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ لیکن اسلامی تاریخ اس زمانہ میں جن اصولوں کے ساتھ لکھی جانی چاہیئے وہ اصول ان حضرات کے سامنے نہیں ہیں۔ ورنہ کم سے کم سید سلیمان ندوی صاحب نے اس کی اصلاح کی ہوتی جنہوں نے اسپر مقدمہ لکھا ہے لیکن اس باب میں تو آں خانہ ہمہ آفتاب است۔

مطالعۂ حافظ | مصنفہ مولوی محمد احتشام الدین صاحب حقی دہلوی ایم اے علیگ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ضخامت ۱۶۰ صفحے قیمت — ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب، اردو بازار۔ دہلی

مولوی احتشام الدین صاحب نے جو دیوان حافظ شیراز کے ماہر خصوصی ہیں خود انکے کلام سے انکے حالات کو نہایت کاوش اور دقیقہ رسی کے ساتھ لکھا ہے جو کچھ لکھا ہے اگرچہ اس میں بحث کی گنجائش ہے لیکن ذوقِ صحیح کے خلاف نہیں ہے، بالخصوص حافظ کے اوپر سے رندی اور سرمستی کے الزام کو جو نا واقفوں اور ظاہر بینوں نے لگا رکھا ہے اس تفصیل اور خوبی کے ساتھ رفع کیا ہے کہ مجال انکار باقی نہیں رہتی۔ (واضح رہے کہ رندی اور سرمستی مسلک گوسفندی سے جداگانہ چیز ہے) بیان کا پیرایہ دلچسپ ہے اور زبان کا انداز دلکش۔

البیان (اقبال نمبر) حضرت علامہؒ کی وفات کے بعد ملک کے مختلف رسائل وجرائد نے ان کی بارگاہِ عالیہ میں اپنی عقیدت ومحبت کے نذرانے پیش کئے اور یہ سلسلہ اسوقت تک جاری ہے۔ چنانچہ اُمتِ مسلمہ (امرتسر) کے ماہنامہ البیان کا زیرِ نظر پرچہ بھی اسی گلدستہ کا ایک تر وتازہ پھول ہے اس مجموعہ میں بعض جواہر پارے واقعی ایسے ہیں جن کی اس سے پہلے نمائش نہیں ہوئی اور ان میں سب سے قیمتی ہدیۂ محبت جناب عرشی کا ہے۔

حضرتِ علامہؒ چونکہ اپنے زمانہ سے بہت آگے تھے اسلئے انھوں نے اپنے افکارِ گرامی کا بیشتر حصہ تشبیہات واستعارات کے حسین پردوں میں چھپا کر پیش کیا ہے "تاکہ جوں جوں زمانہ کے طرۂ خمدار کے پیچ کھلتے جائیں یہ حقائق ومعارف بھی بے نقاب سامنے آتے جائیں لیکن وہ اپنی پرائیویٹ صحبتوں میں انہی حقائق کو زیادہ کھلے الفاظ میں بیان فرمایا کرتے تھے اور ہر سننے والا بقدرِ ظرف ان سے بہرہ یاب ہوجایا کرتا تھا۔ کرنے کا کام یہ تھا کہ اس قسم کی پرائیویٹ محفلوں کے ملفوظات کو نہایت احتیاط سے محفوظ کرلیا جاتا تاکہ ان سے اُنکے کلام کے صحیح مطالب تک پہونچنے میں مدد ملجاتی" لیکن عقیدتمندانِ اقبالؒ کی جہاں اور بہت سی للچائی ہوئی نظریں محض حسرت بن کے رہ گئیں ہیں انہی میں یہ گوشہ بھی شامل ہے۔ جنابِ عرشی نے مجموعہ زیرِ نظر میں اپنی بعض ملاقاتوں کے کوائف وتاثرات قلمبند فرماکر بزمِ اقبال میں ایک جدید شمع کا اضافہ فرمایا ہے جسکے لیئے صاحبِ مضمون اور ارکان البیان مستحق تبریک وتہنیت ہیں۔ عرشی صاحب کو قرآن کریم سے محبت اور حضرتِ علامہؒ سے گہری عقیدت تھی اسلیئے انکے لیئے معارفِ قرآنی کے علاوہ اور کیا موضوعِ گفتگو ہوسکتا تھا۔ چنانچہ انکے مضمون میں شروع سے اخیر تک اسی موضوع کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے چلے گئے ہیں۔ اور عرشی صاحب کا خلوص وعشق ایک ایک لفظ سے چشمۂ کوثر وسلسبیل کی طرح اُبلتا نظر آرہا ہے پھر احتیاط بھی اس قدر پیشِ نظر ہے کہ انھیں ہر مقام پر اسکا اعتراف ہے کہ اس روئداد کی حیثیت "روایت" کے درجہ تک ہی ہے اس سے آگے نہیں۔ اور بات بھی ٹھیک۔

پھر اس مجموعہ میں "یادِ ماضی" کے عنوان سے جناب عرشی، حضرت علامہؒ۔ مولانا ظفر علی خاں

اور جناب طغرائی مرحوم کی نظمیں شائع ہوئی ہیں حضرت علامہؒ کی یہ نظم ان کے کلیات میں موجود نہیں۔ اس لیے یہ بھی ایک نادر تحفہ ہے۔ اسی طرح بعض غیر مطبوعہ خطوط بھی پرچہ میں شامل ہیں۔ یہ پرچہ یقیناً سنبھال کر رکھ لینے کے قابل ہے اور آٹھ آنہ میں تو بالکل مفت کے برابر ہے۔

زمزم (ماہنامہ) یہ پرچہ جناب زاہد القادری صاحب کی زیرادارت اور مولانا اسمٰعیل ذبیح (مہاجر مکہ) کی ملکیت میں دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کا پہلا نمبر زیر نظر ہے۔ لا مذہبیت اور دہریت کی روک تھام۔ اور مغربی تہذیب کے مقابلہ میں اسلامی تہذیب کی افضلیت کا ثبوت"۔ اس کے مقاصد بتائے گئے ہیں۔ فہرست مضامین میں "نزولِ قرآن" کے عنوان سے لے کر "مریضِ ہجر کا حال آپ کی بلا جانے" تک قریب قریب ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ زاہد القادری صاحب ایک کہنہ مشق ادیب ہیں۔ اس لیے توقع کی جاسکتی ہے کہ پرچہ عمدگی سے ترتیب پاتا رہے گا۔ طباعت۔ کتابت کاغذ اعلیٰ درجہ کا ہے۔ چندہ سالانہ للعہ، قیمت فی پرچہ ۴ر

مرقع کانگریس۔ یعنی مختصر روئداد ان مظالم کی جو کانگریس کے اڑھائی سالہ "رام راج" میں صوبہ متحدہ کے مسلمانوں پر روا رکھے گئے، جسے مولانا عبدالحامد صاحب (بدایونی) رکن آل انڈیا مسلم لیگ نے نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا ہے۔ کانگریسی عزائم و مقاصد کو بے نقاب کرنے کے لیے اس قسم کے لٹریچر کی بڑی ضرورت ہے۔ صوری حیثیت سے بھی ۴۰ صفحات کا چھوٹا سا پمفلٹ بڑا دلکش ہے اور ۴ر میں ناظم دارالتصنیف۔ مولوی محلہ بدایوں (یو۔ پی) سے مل سکتا ہے

(بقیہ "لمعات" کے اخیر میں ملاحظہ فرمایئے)

اسلام اور مذہبی رواداری

رسالہ کا مضمون اُس کے نام سے ظاہر ہے مشرقی اور مغربی غیر مسلم مصنّفین نے اسلام اور مسلمان خلفا وسلاطین کے خلاف عدم رواداری کا جس قدر شدید پروپیگنڈا کیا ہے۔ اُس نے واقعات اور تاریخ کے چہرے پر ایک سیاہ چادر ڈال دی ہے جس کی وجہ سے اکابر اسلام کو تنگ نظر۔ جابر اور مذہب کے دیوانے سمجھا جا رہا ہے۔ اِس رسالہ کے مصنف نے مستند غیر مسلم مصنّفین کی تصنیفات کے اقتباسات سے یہ ثابت کیا ہے، کہ مسلمان فاتح حکمران اور غالب ہو کر کس قدر وسیع القلب اور آزاد خیال رہے ہیں، انھوں نے غیر مسلم مفتوحین اور اپنی رعایا سے کس درجہ عادل وانصاف، الطاف واکرام، اور امن وسلامتی کا سلوک کیا ہے۔ مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں غیر اسلامی معابد کا تحفظ۔ غیر مسلم رعایا کے مذاہب کی آزادی، اُن کی املاک و اموال کی ذمہ داری اور اُن کی عزت وناموس کی صیانت کے نمونے دیکھنا ہوں تو اس کتاب کو پڑھیے۔ قیمت صرف دفتر طلوعِ اسلام۔ بلیماران۔ دہلی سے منگوائیے +

مستبادلِ دستورِ ہند

ہندوستان کے لیے حکومتِ برطانیہ نے آئندہ طرزِ حکومت کا جو ڈھانچہ تیار کیا ہے اُس میں مسلمانوں کی حیات وبقا کے سامان مفقود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند اس ہندو نواز اسکیم سے بیزاری کا اعلان کر کے علیحدگی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے اِس نا قابلِ قبول اسکیم کے مقابلہ میں ایک ایسی اسکیم پیش کی ہے جس کی رُو سے جملہ اقوامِ ہند کو اپنی اپنی تہذیب ثقافت کے ماحول میں پورے نشو ونما کے مواقع بہم پہنچائیں ایک اسلامی دماغ کی یہ عادلانہ تجویز ہر عاقل ہندوستانی کی توجہ کے قابل ہے، کیونکہ اُس کی بدولت ہندوستان کی سرزمین مختلف اقوام کے خونِ ناحق سے لالہ زار بننے کے بجائے اُن کی منفرد اور مشترک مساعی کو رشکِ جنت بن سکتی ہے!

قیمت صرف

دفتر طلوعِ اسلام بلی ماران دہلی سے طلب فرمائیے

(مکتبہ انتظار احمد)

خدا کی بادشاہت

کرۂ ارض سے زر اور زمین کی ناہموار تقسیم۔ وخائن حسنرائن کی ناجائز ملکیت۔ سرکشی و تمرد کے انسانیت سوز نتیجے۔ اور جوع الارض کا علاج مرض دُور کرنا ہو تو اس کتاب کو پڑھیے۔ جو مساوات، حریت اور عدل کے گم گشتہ اسباق کو یاد دلاتی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرکار دو عالمؐ تاجدار مدینہ نے استخلاف فی الارض کا جو عدیم المثال تصور پیش کیا تھا۔ اور جس کی تکمیل قرآن مجید کی آیات بینات نے فرمائی تھی۔ جسکے بغیر اس دُنیا کو امن و اطمینان نصیب نہیں ہوسکتا۔ اور یہ کہ عیوب و اسقام سے پاک طرزِ سلطنت صرف وہی ہے جسکا خاکہ کلام الٰہی میں دیا گیا ہے۔

قیمت ۱/ ربع صرفہ ڈاک کے ٹکٹ بھیجکر دفتر رسالہ طلوعِ اسلام یا زار بلی ماران دہلی سے طلب فرمایئے۔

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب

حضرت علامہ اقبالؒ کے نظریۂ قومیت کے جواب میں مولانا حسین احمد نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے۔ چونکہ علامہ اقبالؒ کے چند ماہ کے بعد یہ جواب منظر عام پر آیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت مولانا نے نہایت غور و فکر کے بعد اس کو مرتب فرمایا ہے اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے اسکا ایک جواب شائع ہو یہ رسالہ "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب" اسی کا مدلل اور مسکت جواب ہے جس میں شرح و بسط کے ساتھ مولانا مدنی کے دلائل کا جواب کتاب سنت کی روشنی میں دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں متحدہ قومیت کا تصور کیا ہے۔ اور فرنگی لغت میں اسکی کیا تشریح ہے۔ اسلام کا نظریہ فرنگی یا یورپی نظریہ سے کس طرح متصادم ہوتا ہے مغرب کے ایجاد کردہ قومی تصور میں کیا کیا مفاسد پوشیدہ ہیں یہ کتاب آجکل کے جملہ قومی و سیاسی مباحث کے لیئے قول فیصل کا حکم رکھتی ہے۔ قیمت صرف ۲/

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office Delhi.